ISHAAT ACADEMY

دینِ اسلام کے مفہوم اور فلسفہ پر جامع اور مختصر کتاب

دینِ کامل

یعنی

مکمل نظامِ حیات

تالیف:

مولانا مفتی محمد ایاز صاحب حفظہ اللہ

اشاعت اکیڈمی

اینڈ پرنٹنگ ایجنسی پشاور

091-5515698

دین کامل

یعنی

مکمل نظام حیات

ابو معاویہ مولانا مفتی محمد ایاز حفظہ اللہ

العلم پبلیکیشنز محلہ جنگی پشاور
091-2590315

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
مقدمہ	5	زکوٰۃ	44
اسلام کیا ہے۔۔؟	6	حج	46
اسلام کا نظام عقائد	8	نفلی عبادات	49
وجود باری تعالیٰ	11	ضروری انتباہ	50
توحید باری تعالیٰ	14	جہاد	52
شرک کی تعریف اور اسباب	15	دعوت تبلیغ	54
آخرت پر ایمان	21	اسلام کا نظام اخلاق	57
قبر اور عالم برزخ	22	اخلاق حسنہ اور سیئہ کے مبادی	58
رسالت	23	تہذیب اخلاق کا طریقہ	58
بشریت انبیاء علیہم السلام	24	اسلام میں اخلاق کی اہمیت	59
معجزات	26	اسلام کا نظام معاملات و معاشیات	61
عصمت انبیاء علیہم السلام	27	اسلامی نظام معاش	63
ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	28	اسلامی نظام معاشرت	70
صحابہ کرامؓ	30	خاندان	75
سلف صالحین اور آئمہ مجتہدینؒ	32	قرابت، ہمسائیگی، مسجد	75
ملائکہ پر ایمان	34	تعلیم	76
کتابوں پر ایمان	35	اسلامی نظام سیاست و ریاست	77
تقدیر پر ایمان	36	اسلامی ریاست (خلافت)	80
اسلام کا نظام عبادات	40	اسلامی ریاست کے مقاصد اور ذمہ داریاں	82
نماز	40		
روزہ	43	اسلامی خلافت کا طریقہ کار	87

مقدمة

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی ھَدَانَا لِکَامِلِ الدِّیْنِ الْاِسْلَامِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی نَبِیِّہِ الَّذِی شَرَحَ الدِّیْنَ بِاَوْضَحِ الْبَیَانِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الَّذِیْنَ ھُمْ مَعْیَارُ الْاِیْمَانِ وَعَلَی الْعُلَمَاءِ الَّذِیْنَ عَلِمُوْا النَّاسَ دِیْنَ الْاِسْلَامِ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطَانِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

[بقرہ:۲۰۸]

”اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔“

دنیا کے ہر سچے اور جھوٹے مذہب، ہر مفید یا غیر مفید جماعت اور ہر اچھی یا بُری تنظیم کے لیے کچھ بنیادی اُصول اور چند فکری واعتقادی بنیادیں ضروری ہوتی ہیں جس سے ان کے مقاصد کا تعین اور سمت مقرر ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اس مذہب یا جماعت کے اراکین اور ماننے والوں کے لیے دستورِ اساسی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو شخص ان جماعتوں، مذاہب یا تنظیموں کا رکن بننا چاہتا ہے وہ پہلے ان کے بنیادی امور یا منشور کا مطالعہ کرتا ہے اگر ان کے درست ہونے کا یقین ہو جائے، اس کا ذہن و فکر ان باتوں کو قبول کرلے اور اسکے شکوک و شبہات دور ہو جائیں تو وہ اس جماعت کا ممبر بن کر اس کے اراکین و متبعین میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس پر لازم ہوتا ہے کہ دستور کے مطابق تمام فرائض پورے کرے اور اپنے طرز عمل سے بنیادی اصولوں پر ایمان واخلاص کا ثبوت پیش کرے اور اس اختیار کردہ مذہب، تنظیم یا جماعت کے بنیادی اصولوں کو یاد رکھے، اس کے خلاف کوئی کام نہ کرے بلکہ اپنے طرزِ عمل سے اس جماعت کے مقاصد کا اعلیٰ نمونہ بن کر رہے اور اپنی عملی زندگی سے دوسروں کو متاثر کرکے اس جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دے۔ گویا کسی جماعت کا رکن بننے کے معنی یہ ہیں کہ رکن کو اس جماعت کے نظام سے پوری واقفیت ہو، اس کے اصولوں کا پابند رہے، اس کے احکام کی

اطاعت کرے اور اپنی پوری زندگی طے شدہ اصولوں کے مطابق بسر کرے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جس کا عام مسلمان پر من و عن اطلاق ہوتا ہے۔

اسلام کیا ہے۔۔۔؟

عقلِ انسانی چونکہ محدود ہے تاہم کائنات کی وسعت و آفاقیت کا احاطہ اور مستقبل کے ادراک سے قاصر ہے چنانچہ انسان کے لئے صحیح راہِ عمل اور متوازن نظامِ حیات صرف وہی ذات وضع کر سکتی ہے جس نے اسے پیدا کیا۔ اِس خالق نے جو نظامِ حیات جن و انس کی کامیابی کے لیے وضع کیا ہے اسے دینِ اسلام کہتے ہیں۔ اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی راہنمائی کے لیے دنیا و آخرت کی ابدی کامیابیوں کا ضامن ہے اور ہر دور میں کسی بھی ملک و ملت کے لیے اصلاح و فلاح کا جامع نظام و پروگرام (Complete system) رکھتا ہے جو گزشتہ ، موجودہ اور آئندہ مسائل کا واحد حل ہے۔ دیگر رائج الوقت مذاہب و نظام ہائے حیات، اسلام کے مقابلے میں ہر لحاظ سے نامکمل ہیں، جو کبھی بھی پوری انسانی زندگی کا احاطہ نہیں کر سکتے، جبکہ اسلام ہی ایک ہمہ گیر و عالم گیر نظامِ حیات ہے جو ہر شعبۂ حیات خواہ وہ نظریات و عقائد ہوں، عبادات و معاشرت ہو ، معیشت و سیاست ہو، انفرادیت ہو یا اجتماعیت کے بارے میں مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ جو شخص اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ سب سے پہلے اسلام کو عقلی بنیادوں پر کھلے دل سے قبول کرے اور ان کی پوری طرح تصدیق کرے تاکہ وہ اس کا عقیدہ بن جائے اور پھر اس کے احکامات کو عملی جامہ پہنائے۔ جب کسی شخص نے اسلامی عقائد و احکامات کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کر لیا تو وہ مسلمان ہو گیا۔ گویا اب وہ دولتِ اسلامیہ کا حقیقی فرد قرار پا گیا۔ اس نے ان تمام فرائض کی ادائیگی قبول کر لی جن کا ادا کرنا از روئے اسلام ایک مسلمان پر واجب ہے اور اسے وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے جو ایک مسلمان کو حاصل ہیں۔

اسلام صرف اللہ کو ماننے اور صوم و صلوۃ کا نام نہیں اور نہ صرف بد نام زمانہ سیاست کا نام ہے جیسا کہ نشۂ اقتدار میں مست جھوٹے مدعیانِ سیاست کی سوچ ہے بلکہ انسانی زندگی کے

جملہ نظریات، واعتقادات وعبادات ،افعال وکردار، معاملات وتعلقات اور معاشرت وسیاست کے بارے میں واضح احکام پر مبنی شش رکنی نظام :

(۱) عقائد (۲) عبادات (۳) اخلاق

(۴) معاملات (معاشیات) (۵) معاشرت (۶) سیاست وریاست

پر مشتمل مکمل دین ہے۔ کسی ایک بھی جز یا رکن کو اختیار کرکے دوسرے احکام و شعبہ ہائے زندگی کو نظر انداز کرنا اسلام کی روح کے خلاف ہے۔الغرض اسلام کے پیش نظر اخروی سعادت اور رضاء الٰہی کے ساتھ ساتھ دنیوی ترقی وکمال کا حصول لازمی ہے اور یہ دین و دنیا کا ایک قوی امتزاج ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اعتقادی ،عباداتی ، اخلاقی، معاشی، معاشرتی وسیاسی نظاموں کو ایک دوسرے سے قطعاًالگ نہیں کیا جاسکتا بلکہ سب ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں اور ہر عمل، حکم ورکن اوردین کی پختگی، عقائد سے بہر صورت پیوست ہے یعنی عقیدہ تمام شعبہ ہائے حیات کے لیے بمنزلہ بنیاد عمل عقیدے سے لازمی طور پر مربوط ہیں۔اگر کسی کے عقائد واعمال، اخلاق ومعاملات، معاشرت وسیاست بظاہر درست نظر آتے ہوں لیکن اسکا عقیدہ صحیح نہ ہو تو دیگر تمام اعمال اور کوششیں رائیگاں ہیں۔اب اس مکمل دین اسلام کے شعبہ ہائے حیات (چھ ارکان) کا مختصر تذکرہ ترتیب سے کیا جاتا ہے تاکہ اسلام کی حقیقی روح اور فلسفہ سے واقف ہو کر اس کے داعی و قائم کرنے والے بنیں۔

اسلام کا نظامِ عقائد

Islamic Faith System

اسلام میں عقائد کو اساسی حیثیت حاصل ہے جس کے بغیر دین اسلام کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی اور کوئی عبادت یا نیک عمل صحیح عقیدے کے بغیر اللہ رب العزت کے ہاں میں شرفِ قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔اس لیے عقائد کی درستگی کو نظر انداز کرنا اور باقی اعمال واحکام بجالانے کی مثال ریت (کمزور بنیادوں) پر آبادی کی مانند ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ [النور:۳۹]

"جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اسے پانی سمجھے یہاں تک کہ جب اس کے پاس آئے تو اسے کچھ بھی نہ پائے اور خدا ہی کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اسے اس کا حساب پورا پورا چکادے۔اور خدا جلد حساب کرنے والا ہے"۔

موجودہ دور کے بگڑے ہوئے حالات سے دل برداشتہ بہت سے لوگوں اور سیاسی کارندوں کے اندر یہ مزاج پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر اس شخص کے جو انقلاب کا نعرہ لگائے یا کسی بڑی طاقت کو چیلنج کرنے کے نتیجے میں عقیدے کے ہر بگاڑ اور افکار و نظریات کی کج روی کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔اسلام کے خلاف عقیدہ رکھنے والوں سے اتحاد کر لیتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس اِن لوگوں کو جو ایسے موقعہ پر عقیدہ کی بحث کو اٹھائیں ہدفِ ملامت بناتے اور باطل قوتوں سے پینگیں بڑھانے کا الزام دھر لیتے ہیں۔ان کا یہ طرزِ عمل دینی مزاج اور منہج نبوی کے خلاف ہے۔

درست اور صحیح عقیدے و تصور کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔زندگی کے بارے میں کسی معاشرے کا اختیار کردہ عقیدہ و تصور جتنا جامع اور کامل ہوگا اتنا ہی وہ معاشرہ مضبوط اور پائیدار ہوگا۔اسکے برعکس نظریۂ حیات جتنا ناقص ہوگا اتنا ہی معاشرے کے افراد کمزور، منتشر اور

تذبذب کا شکار ہونگے لہٰذا اسلام کا نظریۂ حیات دیگر مذاہب کے مقابلے میں یقیناً ایک جامع اور کامل تصور پیش کرتا ہے اور یہی اسلام کی امتیازی شان اور نمایاں خصوصیت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام ایک ہی عقیدے کی دعوت دیتے تھے اور اس کے بارے میں کسی قسم کی مفاہمت و مداہنت سے پرہیز کرتے تھے۔ انھوں نے عقیدے کی بنیادوں پر کسی قسم کی کوئی ترمیم یا تغیر و تبدل کو گوارہ نہیں کیا۔ عقائد اور حدود اللہ کے بارے میں ہر دور کے انبیائے کرام علیہم السلام فولاد سے زیادہ سخت اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور بے لچک تھے۔ ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی اور اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی کردار کا حامل، نیکی وصلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ پیکر، عمل و عبادات کا مثالی مجسمہ (خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرے کا وجود اور کسی مفید انقلاب کا ظہور ہی کیوں نہ ہوا ہو) اُس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا جب تک زندگی کی ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اسی عقیدے کی بنیاد پر نہ ہوں جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام کا اولین نصب العین تھا۔ یہی وہ حد فاصل اور واضح فرق ہے جو انبیاء علیہم السلام اور دیگر قومی و سیاسی رہنماؤں کے درمیان ہے۔

اسلام کے اہم اور بنیادی عقائد مندرجہ ذیل ہیں اور ان کو ایمانِ مفصل بھی کہا جاتا ہے:

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔

"میں ایمان لایا اللہ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، رسولوں پر، یوم آخرت پر اور خیر و شر کے اللہ کی طرف سے ہونے پر اور موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر۔"

ان تمام عقائد میں سے توحید، آخرت اور رسالت کو "امہات العقائد" یعنی بنیادی عقیدے کہا جاتا ہے۔ ان بنیادی عقائد کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا دارومدار انہیں عقائد پر ہے۔ گویا اسلامی نظام حیات کی یہ تین فکری اور اعتقادی بنیادیں ہیں اس لیے دین میں ان عقائد کی خاص اہمیت ہے اور قرآن میں اسے بے شمار مقامات پر تفصیلی بیان کیا گیا ہے۔

عقائد کی اقسام:

عقائد کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک وہ جن کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا قطعی اور یقینی ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور ہر دور میں ان کو تواتر اور ایسی عام شہرت حاصل رہی ہے کہ ان میں کسی قسم کی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔ جن چیزوں کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درجے کا ہو، اہل علم کی اصطلاح میں ان کو "ضروریات دین" کہتے ہیں۔

"امہات العقائد" یعنی توحید، رسالت، قیامت وآخرت پہلی قسم کے عقیدے ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن مجید کو کتاب اللہ ماننا، آخرت میں جنت اور دوزخ کو تسلیم کرنا، فرشتوں کا ایک مستقل مخلوق ہونا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں بہت سے پیغمبروں کا آنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہونا، یہ سب بھی اسی درجے کے عقیدے ہیں کہ جن کا ثبوت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا ہی یقینی اور قطعی ہے، جیسا کہ توحید، رسالت اور قیامت کا اور ان کو اِسی درجے کا تواتر اور عام شہرت امت میں حاصل رہی ہے۔ اس لئے ان سب باتوں کا حکم بھی یہی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرکے کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا، اگرچہ انکار کسی تاویل کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔ دوسری قسم کے عقائد وہ ہیں جن کا ثبوت اگرچہ قابلِ اطمینان اور پکّا ہے لیکن اس درجہ کی قطعیت اور تواتر ان عقائد کو حاصل نہیں جس کے بعد کسی احتمال اور تاویل کی گنجائش نہ رہے۔

دوسرے درجے کے عقائد کی مثال میں حیات برزخی، عذابِ قبر، قیامت اور آخرت کی بعض تفصیلات مثلاً میزان، صراط، شفاعت، رؤیۃ باری تعالیٰ وغیرہ ہیں۔ قیامت سے پہلے دجال کا ظہور، حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول اور اسی طرح بعض دیگر علاماتِ قیامت کا درجہ بھی یہی ہے۔ یعنی ان کا ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگرچہ قابلِ اطمینان اور پکّا ہے، لیکن

"ضروریاتِ دین" کے معیار کا نہیں۔ اس لئے کسی شبہ یا کسی تاویل کی بنیاد پر ان میں سے کسی چیز کا انکار کرنا اگرچہ سخت درجہ کی گمراہی ہے، لیکن اسے کفر یا ارتداد نہیں کہا جاسکتا۔

الغرض ان عقائد میں سب سے پہلے ایمان باللہ ہے جس کا واضح الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ ہمیں زندگی بخشنے والا، اس تمام جہان و کائنات کا پیدا کرنے، اپنی قدرت سے تمام کائنات کو چلانے والا ایک خالق و مختار موجود ہے جو اپنی ذات، صفات، افعال اور حکم و فیصلہ میں یکتا، واحد اور لاشریک ہے۔

وجود باری تعالیٰ:

انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس طرح ایمان لانا کہ ایک ایسی ذات جو اس تمام کائنات اور سارے عالم کا پیدا کرنے والا ہے، وہ اس کارخانۂ قدرت کا اکیلا صانع ہے جو ازلی اور ابدی ہے جس کے بغیر کسی چیز کا وجود ناممکن ہے ایک ضروری امر ہے، کیونکہ جب کوئی سلیم العقل انسان کسی بنی ہوئی چیز کو دیکھتا ہے تو اسکا ذہن اس چیز کے بنانے والے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مکان کو دیکھ کر معمار کا اور مشین کو دیکھ کر موجد کا تصور ذہن میں آتا ہے، کیونکہ ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ کوئی مکان یا مشینری بغیر معمار و موجد کے بن سکتی ہے۔ بس اسی طرح کائنات پر غور کرنے سے ضرور اسکے بنانے والے کا خیال آئے گا کیونکہ عقل سلیم اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اتنا بڑا منظّم اور مربوط نظام کسی بنانے والے کے بغیر خود بخود وجود میں آگیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے وجود پر بے شمار عقلی اور قرآنی دلائل موجود ہیں جو اکثر دیئے جاتے ہیں لیکن ہم یہاں پر ایک نئے اسلوب سے وجود باری تعالیٰ پر بحث کریں گے۔ وہ لوگ جو وجود باری تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اس کے منکر ہیں، ان دونوں کی حیثیت کا الگ الگ جائزہ لیا جائے تو بات خود بخود کھل جائے گی۔

- وہ برگزیدہ اشخاص جنھوں نے انسانیت کو وجودِ باری تعالیٰ کی طرف دعوت دی، نبوت کا دعویٰ لے کر آئے، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی، انتہائی قُرب، نامہ وپیام اور مناجاتِ حقیقی کا شرف حاصل کیا ہے۔ اور یہ بات وہ کسی اندازے اور ظن و تخمین کی بنیاد پر نہیں کہتے بلکہ ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر کہتے ہیں جو غیر

متزلزل یقین وایمان کے حامل ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو وجودِالٰہی کے منکر ہیں، ان کے پاس اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ ان کے پاس عقل کے علاوہ کوئی اور یقینی ذریعہ علم بھی نہیں ہے۔ وہ ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں، جو بات سمجھ میں آجاتی ہے اُسے مان لیتے ہیں، جو سمجھ میں نہیں آتی ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے افکار انہیں زیادہ سے زیادہ ظن و تخمین تک لے جاتے ہیں، انہیں خود بھی اپنے افکار پر غیر متزلزل یقین حاصل نہیں ہوتا۔

- وجودِ باری تعالیٰ کے قائل پیامبر مختلف زمانوں اور جگہوں میں بھیجے گئے ہیں۔ کوئی عرب میں، کوئی مصر میں، کوئی ہزار سال پہلے، کوئی ہزار سال بعد، لیکن سب لوگ اپنے دعوے میں یک زبان ہیں، ان کی تعلیمات بھی بنیادی طور پر ایک جیسی ہیں گویا کہ وہ سب ایک ہی ذریعہ تعلیم سے مستفید ہو کر آئے ہیں۔ اس کے برعکس منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ کے خیالات ہمیشہ سے مختلف رہے ہیں۔ خواہ وہ ایک ہی علاقے سے تعلق رکھنے والے ہوں یا دور دراز آباد ہوں، چاہے ایک ہی زمانہ میں ہوں یا کچھ پہلے اور کچھ بعد میں ہوں سب کے نظریات باہم مختلف ہیں۔ اُن کا آپس میں کوئی اتفاق نہیں۔
- حضراتِ انبیاء علیہم السلام نے اپنے موقف میں زندگی بھر کے لیے کبھی تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے برعکس منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ کو مختلف مسائل میں اپنی پہلی رائے کو مسترد کرتے ہوئے دوسرے موقف پر پایا گیا ہے۔ ان کے اکثر مفکرین کا حال یہ ہے کہ کل تک جس نظریہ کو پورے زور شور کے ساتھ پیش کرتے رہے اور کچھ عرصہ بعد اپنے ہی نظریئے کی تردید کرکے ایک نیا شگوفہ گھڑ لیتے ہیں۔
- داعیانِ وجودِ باری تعالیٰ (انبیاء علیہم السلام) اپنے کردار یعنی راستبازی، امانت، صداقت، حسنِ خلق ہر چیز میں اپنے معاشرے کے ممتاز ترین انسان تھے، جس بات کی تعلیم دیتے تھے پہلے خود اس کا عملی مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ کے کردار اور تعلیمات میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوا ہے کہ جن نظریات کا پرچار انھوں نے کیا وہ خود اس پر عمل نہیں کرسکے۔

- داعیانِ وجودِ باری تعالیٰ (انبیاء علیہم السلام) نے اپنی زندگی میں بے پناہ تکالیف کا سامنا کرنے کے باوجود دنیا میں اپنے ہمسایوں اور رشتہ داروں کے درمیان انتہائی مطمئن اور کامیاب زندگی گزاری ہے۔ اس کے برعکس منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ تمام دُنیوی آسائشوں کو حاصل کرنے کے باوجود بھی انتہائی پریشان حال اور ناکام نظر آتے ہیں۔ ان میں بہت سے مفکرین ایسے ہیں جنھوں نے دنیا سے تنگ آکر خود کشی کرڈالی۔
- انبیاء علیہم السلام کے بارے میں تاریخِ انسانیت یہ متفقہ فیصلہ سناتی ہے کہ سب سے زیادہ انھوں نے ہی انسانیت کو متاثر کیا ہے اور تمام اسلامی انقلابات انہیں کی بدولت آئے۔ اس کے برعکس انسانیت نے منکرینِ وجودِ باری تعالیٰ کی تعلیمات سے کوئی گہرا اثر نہیں لیا اور نہ وہ کسی اہم اصلاحی انقلاب کا باعث ہوئے ہیں۔

اب اگر ان تمام نکات کو سامنے رکھا جائے تو عقلِ سلیم بلا جھجک داعیانِ وجودِ باری تعالیٰ یعنی انبیاء علیہم السلام کے حق ہی میں فیصلہ کرے گی۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اتنے عاقل، پاک سیرت اور صادق القول آدمیوں نے متفق ہو کر آج تک کسی دوسرے نظریئے کی تائید اتنی قوت اور یقین وایمان کے ساتھ نہیں کی ہے۔

مزید برآں یہ کہ ایسے پاکیزہ سیرت اور اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں اس دعوے پر متفق ہو جانا کہ ان سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعہ علم ہے اور وہ ہے وحی یعنی اللہ تعالیٰ سے براہِ راست نامہ وپیام اور پھر ان سب حضرات کا ایک ہی دعوت دینا، ایک ہی تعلیم کا پرچار کرنا، اور اس کے لیے انتہائی شدید اذیتیں برداشت کرنا حتیٰ کہ اس راہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے اس کے علاوہ کوئی ہزار میل مشرق میں تو کوئی ہزار میل مغرب میں، کوئی ہزار سال پہلے تو کوئی ہزار سال بعد، کیا یہ سب محض اتفاق ہی اتفاق ہے؟ اس کو اتفاق تو صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی فطرت مسخ ہو چکی ہو اور عقل کا چراغ گل ہو گیا ہو۔

توحیدِ باری تعالیٰ:

اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہونے کے بعد سب سے اہم مسئلہ اُس کی وحدانیت پر ایمان ہے جس کے لئے تمام انبیاء علیہم السلام انسانیت کی طرف بھیجے گئے تھے ان سب نے توحید کی دعوت دی ہے، لیکن اس کے باوجود لوگوں نے سب سے زیادہ کوتاہی بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور مسئلہ توحید پر عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر دنیا کے پیدا کرنے والے دو یا دو سے زیادہ خدا ہوتے تو دنیا میں کسی بھی چیز کا وجود میں آنا ہر گز ممکن نہیں تھا اور یہ سارا قدرتی کارخانہ بالکل درہم برہم ہو جاتا جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

لَوْكَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا [انبیاء: ۲۲]

"اگر زمین و آسمان میں ایک اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بھی ہوتے تو کائنات کا نظام بگڑ جاتا"

کیونکہ ایک الٰہ دنیا پر بارش برسانا چاہتا تو دوسرا پانی کی قلّت پیدا کرنا چاہتا، ایک خدا کسی بندے کو اولاد سے نوازنا چاہتا تو دوسرا اپنے بندے کو بے اولاد رکھنے کا خواہش مند ہوتا اور نتیجتاً ان خداؤں کے درمیان جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہتا جیسے دنیا کے بادشاہوں کا حال ہے۔ کبھی پہلا دوسرے پر اور کبھی دوسرا پہلے پر غالب آتا، کبھی ایک خدا عرش پر مستوی ہوتا، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ [مومنون: ۹۱]

"ورنہ اس کے ساتھ کوئی معبود ہے، ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر غالب آ جاتا"

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔ [بنی اسرائیل: ۴۳، ۴۲]

"کہہ دیجیے اگر اللہ واحد کے ساتھ کچھ اور الٰہ (خدا) ہوتے جیسا کہ مشرک کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ ضرور خدائے مالکِ عرش کی طرف لڑنے بھڑنے کے لیے راستہ نکالتے۔ تو پاک اور بلند ہے اللہ اس بات سے جو یہ مشرک کہتے ہیں"۔

بہر حال دنیا کا یہ نظام بغیر کسی فساد و بگاڑ کے جاری و ساری رہنا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی واضح دلیل ہے۔ پس توحید کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات و صفات، اسماء وافعال، حکم و فیصلہ اور قانون میں یکتا و وحدہ لاشریک جان کر صرف اُس کی عبادت واطاعت کرنا۔ اور یہی کلمہ طیبہ کے پہلے جز لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا مفہوم و مقصود ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ، حاجت روا، مشکل کشا، عبادت کے لائق، عالم الغیب، حاضر و ناظر، متصرف، برکات دہندہ، غائبانہ پکاریں سننے والا، ہر جگہ سے ہر حال میں دور ونزدیک سے ہر کسی کو سننے اور دیکھنے والا، عزت و ذلت کا مالک، رکوع، سجدہ، طواف، نذر و نیاز کے لائق، اولاد و برکات دینے والا، بیماری اور تکلیف دور کرنے والا، حاکم اور قانون بنانے والا، حاکمیت اعلیٰ کا حق دار، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور ان صفات میں نوری و ناری، خاکی، فرشتہ و جن، انسان، نبی، ولی، بزرگ میں سے کوئی مخلوق اس کا شریک نہیں اور یہی قرآن کا مدعا بھی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ [بقرہ: ۱۶۳]

”اور تم سب کا ایک ہی الٰہ ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ بہت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے“

شرک کی تعریف:

اشیاء اپنے اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ معرفتِ توحید حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں شرک کی حقیقت بھی معلوم ہو۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَالشِّرْكُ اَنْ يُّثْبَتَ لِغَيْرِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى شَيْءٌ مِنَ الصِّفَاتِ الْمُخْتَصَّةِ بِهٖ۔

[فوز الکبیر ۲۰]

”شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفات میں سے کوئی صفت غیر اللہ کے لیے ثابت کی جائے“۔

شرک کے معنی صرف یہ نہیں کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم مرتبہ و ہم سر قرار دیا جائے، بلکہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ وہ کام یا وہ معاملہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی بلند و بالا ذات کے ساتھ خاص فرمایا اور جس کو عبودیت یعنی بندگی کا شعار بنایا ہے۔ جیسے کسی

کے سامنے سجدہ ریز ہونا، کسی کے نام پر قربانی کرنا، نذریں ماننا، مصیبت و تنگی میں کسی سے غائبانہ مدد مانگنا اور یہ سمجھنا کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، عالم الغیب ہے، اور اللہ کے سوا کسی اور کو کائنات میں متصرف سمجھا جائے۔ اسی طرح کائنات میں آسمانی برجوں، سیاروں کی تاثیر پر اعتقاد رکھنا، کاہنوں، نجومیوں اور غیب کی باتیں بتانے والوں پر اعتماد کرنا۔ یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن سے شرک لازم آتا ہے اور انسان اِس سے مشرک ہو جاتا ہے۔ خواہ اُس کا یہ اعتقاد ہی کیوں نہ ہو کہ انسان، فرشتہ یا جن، نبی یا ولی یا قبر والا جس کے سامنے وہ سجدہ ریز ہو رہا ہے یا جس کے نام پر جانوروں کی قربانی دے رہا ہے، نذریں چڑھا رہا ہے اور جس سے مدد مانگ رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے رتبہ اور مقام میں کم ہیں۔ صاف ذہن اور حق کی تلاش کے جذبے کے ساتھ گہرائی سے قرآن پاک کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کفار اپنے معبودانِ باطلہ کو اللہ تعالیٰ کا بالکل ہم سر اور ہم مرتبہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ ہمارے معبودان مخلوق اور بندے ہیں۔ ان کا کبھی یہ عقیدہ نہیں تھا کہ ان کے معبود، اللہ تعالیٰ سے قدرت وطاقت میں کسی طرح کم نہیں اور وہ اللہ کے ساتھ ایک ہی پلڑے میں ہیں، بلکہ ان کا کفر و شرک تو صرف یہ تھا کہ وہ اپنے معبودانِ باطل کو غائبانہ پکارتے، ان کے نام کی نذریں چڑھاتے اور اُن کے آستانوں پر جانوروں کی قربانی پیش کرتے، ان کو مشکل کشا، کارساز اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وسیلہ اور سفارشی سمجھتے تھے۔ اس لیے ہر وہ شخص جو کسی بھی مخلوق کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو کفار و مشرکین اپنے معبود انِ باطلہ کے ساتھ کیا کرتے تھے تو گویا کہ وہ اس کا اقراری ہوا کہ وہ ایک مخلوق اور غیر اللہ کا بندہ ہے اس لیے زمانہ جاہلیت کے بڑے سے بڑے بت پرست مشرک اور اِس شخص میں کوئی فرق نہیں ہے۔

یہی بُت پرستی، آباء پرستی، اکابر پرستی، بزرگ پرستی اور شرک، عالمگیر اور سخت جاہلیت ہے جو کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں اور یہی نوع انسانی کا وہ قدیم و مہلک ترین مرض ہے جو تاریخِ انسانی کے تمام ادوار، تمدن و معاشرت، معیشت وسیاست اور تعلیم کے تمام تغیرات وانقلابات کے باوجود بھی بندگان خدا پر اپنی گرفت کو مضبوط کر رکھا ہے۔ یہ ہر گز جائز

نہیں کہ نئے اصلاحی و دعوتی تقاضوں اور زمانے کی نئی ضرورتوں کے اثر سے تردید شرک کی اہمیت کو کم کر دیا جائے اور دعوت و تبلیغ کے بنیادی اُصولوں میں اس کو ضمنی یا ثانوی حیثیت دے دی جائے، یا سیاسی اطاعت اور انسانوں کے وضع کیے ہوئے کسی نظام و قانون کے قبول کرنے اور غیر اللہ کی عبادت کو اس کے ساتھ ایک ہی درجے میں رکھا جائے یا یہ سمجھ لیا جائے کہ شرک [جاہلیتِ قدیم، جب انسانی ذہن اور علم و تمدن دورِ طفولیت میں تھے]، کی بیماری وخرابی اور جہالت کی ایک بھدّی اور بھونڈی شکل تھی، جو انسان صرف غیر ترقی یافتہ اور غیر متمدن دور ہی میں اختیار کر سکتا ہے اور اب اس کا دور گزر گیا، اور اب تو انسان بہت ترقی کر چکا ہے، اب اس کا ذہنی انحراف تو صرف نئی نئی ترقی یافتہ شکلوں ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ اور طرزِ فکر، مشاہدے و تجربے اور واقعات کے خلاف بلکہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی متصادم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلشِّرْكُ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَخْفٰى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلَةِ السَّوْدَآءِ عَلٰى صَفَاةٍ السَّوْدَآءِ فِيْ ظُلْمَةِ اللَّيْلِ، رواہ ابن سنی فی عمل اللیل والنہار [مسند احمد: ۱۰۵]

"اس امت میں شرک اتنی پوشیدہ انداز میں پھیلے گا جس طرح اندھیری رات میں سیاہ چٹان پر سیاہ چیونٹی کے چلنے کی رفتار ہو"۔

آج بھی شرک اور بت پرستی اعلانیہ طور پر موجود ہے اور تمام اقوام و ممالک، پورے پورے کے ملک بلکہ بہت سے مسلمان تک شرک جلی کے ناسور میں مبتلا ہیں اور قرآن کا یہ اعلان آج بھی صادق ہے کہ:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔ [یوسف: ۱۰۶]

"اور ان میں اکثر کا حال یہ ہے کہ خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں"۔

شرک کے اسباب:

عام طور پر معاشرے میں شرک مندرجہ ذیل راستوں سے آتا ہے:

ا۔ بزرگوں کی تعظیم میں غلو:

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ توحید کے راستے سے ہٹنے اور شرک میں گرفتار ہونے کا سب سے بڑا سبب انبیاء علیہم السلام ،اولیائے کرام اور صالحین کی تعظیم میں مبالغہ، انتہا پسندی اور دیوانگی کی حد تک محبت ہے۔ یہی محبت شخصیت پرستی اور یادگار پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی محبت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چند اور کرشن کو بندے سے خدا کا رتبے تک پہنچا دیا اور آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اولیائے کرام کی محبت کے دعوے داروں کا بھی یہی حال ہے۔ حالانکہ یہ لوگ محبت کے شرعی آداب سے واقف ہی نہیں۔ اسی اندھی محبت کو قرآن نے غلو فی الدین کہا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ [نسآء: ۱۷۱]

"اے کتاب والو! اپنے دین میں غلو (حد سے تجاوز) مت کرو"

اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

لَا تُطْرُونِي كَمَا أَطْرَتْ النَّصَارىٰ ابْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُولُوا عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُهُ

[بخاری و مسلم]

"تم میرے مرتبے میں غلو نہ کرنا جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حد سے تجاوز کر گئے، اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں تو مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی سمجھو"۔

۲۔ صفاتِ الٰہیہ میں شرک:

بعض لوگ نا سمجھی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی صفات الوہیت میں انسانوں کو شریک کر دیتے ہیں۔ مثلاً اللہ کی صفت سمیع و بصیر میں مخلوق انبیائے کرام، اولیائے عظام اور اہل قبور کو اس صفت میں اس طرح شریک ٹھہرانا کہ وہ ہر جگہ دور و نزدیک سے ہر کسی کو دیکھ اور سن

سکتے ہیں۔ اسی طرح کائنات کے امور میں تصرف اور علم غیب کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ انبیائے کرام، اولیائے عظام، پیر و فقیر، فرشتہ و جن عالم الغیب ہیں، چھپی ہوئی چیز کا علم رکھتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی قوت اور اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں، جبکہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو افضل البشر اور سید الرسل ہیں کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ [اعراف: ۱۸۸]

"اے پیغمبر ان سے کہہ دیجیے کہ میرے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پاس اپنی ذات کے لیے بھی کسی قسم کے نفع و نقصان کا اختیار نہیں ہے، اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور (نہ عالم الغیب ہوں کیونکہ) اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اپنے لئے بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا"۔

۳۔ درمیانی واسطے اور وسیلے:

شرک کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب درمیان واسطے اور وسیلے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تک براہ راست پہنچنا تو ممکن نہیں ہم چونکہ گناہگار ہیں اس لیے اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے بہت سے وسیلے اور واسطے اختیار کرنے پڑیں گے۔ چنانچہ وہ انبیاء علیہم السلام وصالحین اور اہل قبور کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا واسطہ یا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ بالکل یہی حال مشرکین مکہ کا تھا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى [زمر: ۳]

"ہم اپنے معبودانِ باطلہ کی عبادت اِس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے ہاں مقرب بنادیں"

حالانکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ [ق: ۱۶]

"ہم انسان کو اُن کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں"۔

لہٰذا خالق کائنات تک پہنچنے کے لئے کسی قسم کے درمیانی واسطوں کی ضرورت نہیں۔

۴۔ کشف و کرامات:

بعض لوگوں سے کشف و کرامات صادر ہوتی ہیں ان کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لوگ خود تواللہ اور خدا نہیں، لیکن ان میں کچھ نہ کچھ خدائی کا شائبہ ضرور ہے حالانکہ اگر کشف ہی بزرگی کا معیار ہوتا تو جنگ بدر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرشتے اُترتے ہوئے نظر نہیں آرہے تھے جبکہ شیطان فرشتوں کو دیکھ سکتا تھا جس کا ذکر سورۃ انفال آیت نمبر (۴۸) میں ہے۔ اب کیا کوئی مائی کا لال یہ کہہ سکتا ہے کہ نعوذ باللہ شیطان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں زیادہ بزرگی والا ہے؟ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے کاموں کا کشف نہیں ہوا۔ پس معلوم ہوا کشف و کرامات بزرگی اور ولایت کا معیار نہیں ہیں اور نہ کرامت ولی کا اختیاری فعل ہوتا ہے بلکہ اللہ کا فعل اور اللہ ہی کے ارادہ اور اختیار سے کسی مقبول بندے کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے ولی کو صرف اس کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ عقائد کی کتابوں میں کرامت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

هُوَفِعْلُ اللهِ تَعَالٰى خَارِقٌ لِلْعَادَةِ يَظْهَرُعَلٰى يَدِعَبْدٍ ظَاهِرِصَلَاحَهٗ وَتَقْوٰهُ

"کرامت اللہ کا وہ غیر معمولی اور خارقِ عادت فعل ہے جو اس کے کسی بندے کے ہاتھ پر ظاہر ہو جس کی زندگی بالکل اعلانیہ طور پر صلاح و تقویٰ کی زندگی ہو۔"

اگرچہ کراماتِ اولیاء بجائے خود برحق ہیں، لیکن بعض لوگوں نے اس کی حقیقت اور شرعی حیثیت کو سمجھنے کی بجائے بذاتِ خود اِسے خدائی سمجھ لیا ہے درحقیقت اس کی شرعی حقیقت نہ سمجھنے اور اس کے بارے میں غلط تصور کے سبب ہی لوگ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔

۵۔ تجسیم صفات الٰہیہ یا تشبیہ و تمثیل:

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات میں سے تجسیم کے قائل ہوئے ہیں اور اپنے گمان باطل میں ان کو ایک مستقل وجود میں ڈھال دیا ہے یہاں تک کہ ان کے لیے مجسمے تک تراش لیے ہیں، جو کہ بت پرستی کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ کی تمثیل اور تشبیہ کے قائل ہو گئے ہیں۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ [شوری: ۱۱] "اللہ جیسے کوئی نہیں"

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ [نحل: ۷۴] "اللہ کے لئے مثالیں بیان مت کرو"

آخرت پر ایمان:

جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اُن میں سے یوم الوعید یعنی حساب کتاب کا دن بھی ہے جسے عرف عام میں آخرت کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بتلائی ہوئی اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے اور اس پر یقین رکھا جائے کہ دنیا کی اس فنا ہونے والی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے۔ جہاں انسانوں کو اس دنیا میں اپنے کئے اچھے بُرے اعمال کی جزا اور سزا ملے گی کیونکہ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ عمر بھر بڑی بڑی برائیاں کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں، حرام کماتے اور دوسروں کا حق غصب کرتے ہیں، کمزور پر ظلم کرتے ہیں، عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں اور اسی حال میں دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اکثر لوگ بڑی نیک زندگی گزراتے ہیں، کسی پر ظلم نہیں کرتے، کسی کے ساتھ دھوکہ نہیں کرتے، کسی کا حق نہیں مارتے، اللہ کی عبادت بھی کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض اوقات ان کی زندگی تنگی اور تکلیف سے گزرتی ہے اور اس دنیا میں اُن کو اچھائی کا پورا پورا بدلہ نہیں مل پاتا یہاں تک کہ فانی دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ ہم اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ اس دنیا میں نہ تو اللہ کے نیک بندوں کو اُن کی نیکی کا صلہ اور انعام مل رہا ہے اور نہ ہی مجرموں اور باغیوں کو اُن کے ظلم کی کوئی مکمل سزا دی جارہی ہے تو خود بخود یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزا اور سزا کے لئے کسی دوسری زندگی کا ہونا ضروری ہے اور وہ ہے آخرت کی زندگی جس میں صحیح عقیدہ اور نیک عمل کرنے والوں کو راحتوں اور ابدی نعمتوں والی جگہ جنت اور شرک و کفر اور بد اعمال کرنے والوں کو انتہائی اذیت ناک جگہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ [انفطار: ۱۳]

"یقیناً نیکوکاروں کے لیے جنت ہے اور بدکاروں کے لیے جہنم ہے"۔

اس لیے آخرت کا پیش ہونا اللہ تعالی کا عین عدل و انصاف اور عقل کا تقاضہ ہے۔ عقیدہ آخرت کا انسانی زندگی کے سدھار میں بہت بڑا عمل دخل ہے۔ آخرت کا یقین و ایمان انسان کو جس قدر برائیوں اور بد اخلاقیوں سے روک سکتا ہے کسی دوسری چیز میں اس قدر تاثیر نہیں۔ بے شک حکومت کا قانون اور تہذیبی ترقی یا بُرائی بھلائی کا احساس اور نفس کی شرافت بھی انسان کو برائیوں اور بد اخلاقیوں سے بچانے والی چیزیں ہیں لیکن یہ اتنی موثر اور کارگر نہیں ہوتیں جتنا کہ مرنے کے بعد جزا و سزا کا یقین اور آخرت پر ایمان۔ آخرت کی باقی تفصیلات نبوت ہی کے راستے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ آخرت کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات جزا و سزا، حساب کتاب، پل صراط، شفاعت، میزان اور حوضِ کوثر وغیرہ کے متعلق قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس پر یقین رکھنا بھی ضروری ہے۔

قبر اور عالم برزخ:

آخرت کی زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ ایک تو دوبارہ زندہ ہونے کے بعد میدان حشر میں جمع ہونے اور حساب کتاب کے بعد جنت یا جہنم میں داخل ہونے تک اور دوسرا جنت یا جہنم میں جانے سے پہلے کا مرحلہ ہے جس کو قبر یا برزخ کی زندگی کہتے ہیں۔ برزخ حائل اور پردے کو کہتے ہیں چونکہ یہ زندگی دنیا اور آخرت کی زندگی کے درمیان حائل اور ایک درمیانی زندگی ہے جو نہ دنیا وی ہے اور نہ مکمل طور پر اُخر وی۔ اس لیے اس کو عالم برزخ کہتے ہیں۔ انسان چونکہ دو چیزوں جسم اور روح سے مرکب ہے پھر ان دونوں اجزا کا باہمی تعلق دنیا میں کچھ اس طرح سے ہے کہ تکلیف و مصیبت یا راحت و لذت کی جو کیفیت جسم کی ہوتی ہے روح اس سے تبعاً متاثر ہوتی ہے، مثلاً انسان کو چوٹ لگتی ہے یا آگ سے جل جاتا ہے تو اس کا براہ راست تعلق جسم سے ہوتا ہے، لیکن روح پر بھی یہ تکلیف اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح کھانے پینے سے جسم براہ راست اور روح تبعاً لذت حاصل کرتی ہے۔ الغرض دنیا میں انسان کے وجود اور اس کے حالات میں گویا جسم اصل اور روح اس کے تابع ہے، لیکن قرآن و حدیث

میں غور کرنے سے عالمِ برزخ کا معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی جسم روح کے تابع ہوگا جس کی بہترین مثال انسانی خواب ہے۔ خواب میں انسان جب لذت یا تکلیف محسوس کرتا ہے جس کا اثر براہ راست بدن پر ہوتا ہے اور روح تبعاً اس سے متاثر ہوتی ہے۔ پس مرنے کے بعد قیامت سے پہلے عالم برزخ میں اچھے بُرے حالات، ثواب و عذاب اور انعامات جس کی تفصیلات احادیثِ مبارکہ میں ہیں براہِ راست روح پر گزرتے ہیں اور جسم کا اُس کے ساتھ ایک گونہ تعلق ہے جس سے جسم خوشی یا تکلیف محسوس کر سکتا ہے یعنی جسم تبعًا اس میں شریک ہو گا۔ اس تفصیل کے بعد یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ خواہ انسان کا جسم جہاں بھی ہو چاہے قبر میں ہو یا سمندر میں، مچھلیوں کے پیٹ میں یا کسی درندے کے پیٹ میں یا آگ میں جل گیا ہو بہر حال اُس کی روح تو محفوظ ہے اُسے ضرور عذاب یا ثواب ملتا رہے گا۔

اس طرح اس عالمِ برزخ (قبر) میں منکر نکیر کا سوال کرنا بھی برحق ہے۔ جس میں ہر انسان سے تین سوالات، رب (عقیدہ) کے بارے میں، رسالت (سنت و عمل) کے بارے میں اور دین (قانون) کے بارے میں کیے جاتے ہیں۔ قبر یا برزخ کی زندگی میں تمام دنیاوی زندگی کا عذاب و ثواب نہیں ملتا سوائے ان چند چیزوں کے جن کا تذکرہ احادیث میں ملتا ہے۔ بہر حال برزخ اور قبر کی زندگی کی مثال ایک مجرم کے لئے جیل اور سزاوار ہونے سے پہلے حوالات کی سی ہے۔

رسالت:

اسلامی عقائد میں توحید کے بعد رسالت کا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید ماننے کے بعد ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ اس دنیا میں ہم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے بن کر زندگی گزاریں اور ہمیں علم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات ہمارے لیے کیا ہیں۔ اُس کی طرف سے کن کاموں کی اجازت اور کن کاموں کی ممانعت ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو براہ راست یہ باتیں نہیں بتلاتا اور جو تھوڑی سی عقل اور سمجھ بوجھ انسان کو ملی ہے وہ اس دنیا کی روزمرہ ضرورتوں کے لیے تو کسی حد تک کافی ہے، لیکن یہ معلوم کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے اور وہ کن کاموں سے راضی اور کن سے ناراض ہوتا

ہے، پس ہماری اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسالت و نبوت اور پیغمبری کا سلسلہ اور نظام قائم کیا ہے۔ اور یہ طے کیا کہ اپنے خاص اور منتخب بر گزیدہ نمائندوں کے ذریعے عام بندوں تک اپنی ہدایات اور اپنا قانون پہنچائے گا چنانچہ معلوم ہوا کہ نبوت اور رسالت درحقیقت خود ہماری ضرورت ہے جیسے سورج ، ہوا اور پانی وغیرہ ہماری دنیاوی ضرورتیں ہیں۔

بشریت انبیاء علیہم السلام:

اللہ تعالیٰ کے منتخب نمائندے یعنی انبیاء کرام علیہم السلام جو انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے وہ تمام کے تمام انسان اور افضل البشر تھے۔ یہ سب آدم علیہ السلام کی نسل میں سے تھے اور نوع بشریت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی نوری یا ناری مخلوق نہیں رکھتا تھا۔ خود انبیاء علیہم السلام کا اعلان قرآن میں موجود ہے:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

[ابراہیم :۱۱]

"پیغمبروں نے اُن سے کہا کہ ہاں ہم تمہارے ہی جیسے آدمی ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے (نبوت کا) احسان کرتا ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اعلان بھی قرآن پاک میں یوں کیا گیا ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ [کہف :۱۱۰]

"آپ انہیں کہہ دیجیے کہ میں [محمد رسول اللہ ﷺ] تمہاری طرح بشر ہوں۔"

بہر حال انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ضروری ہے کہ ہدایت کرنے والا انسان کے حالات اور اس کے رجحانات و احساسات سے پوری طرح واقف ہو اور یہ بات چونکہ انسان ہی کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ہمیشہ انسانوں ہی میں سے بھیجے، کیونکہ زمین پر مستقل آبادی وخلافت انسانوں ہی کی ہے اور ان ہی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نبی کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت تو انسان ہی سے پوری ہو سکتی ہے، کیونکہ وہی انسانوں کے مسائل

اور ان کے احوال اور ان کے طبعی تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اگر زمین پر انسانوں کی بجائے فرشتے یا نورانی مخلوق آباد ہوتی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو نبی بنا کر بھیجتا:

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا

[بنی اسرائیل: ۹۵]

"کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے (کہ اس میں) چلتے پھرتے (اور) آرام کرتے (یعنی بستے) تو ہم اُن کے پاس فرشتے کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔"

اسی طرح اِن پیغمبروں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خدائی میں شریک، امور عالم میں حصہ دار یا اللہ کا نائب لاڈلا یا بیٹا نہیں، بلکہ وہ تمام اللہ تعالیٰ کے تابعدار اور عبادت گزار عاجز بندے تھے۔ جن کے اوصاف قرآن بار بار عبد کے طور پر بیان کرتا ہے۔ بہر حال جب ایک آدمی کسی نبی یا رسول پر ایمان لے آئے تو پھر عقل کا فیصلہ اور تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کی ہر بات کی تصدیق کی جائے اور ان کی ہر اطلاع کو دل سے تسلیم کر لیا جائے اور ان کے ہر حکم کو اللہ کا حکم سمجھ کر اطاعت کی جائے، بس یہی نبی کی بعثت کا مقصد ہوتا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ [نساء: ۶۴]

"ہم نے کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔"

رسالت کے باب میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ پیغمبروں کا اپنی قوموں سے جن کی طرف وہ بھیجے جاتے ہیں چٹھی رساں یا ڈاکیہ جیسا تعلق نہیں ہوتا جس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ خطوط اور ڈاک مُرْسَلٌ الیھم تک پہنچائے اور پھر ان لوگوں سے کوئی سروکار نہ رہے۔ ایک امتی کا اپنے ھادی اور پیغمبر سے محض وقتی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی امتی زندگی گزارنے کے طور طریقوں میں آزاد ہوتا ہے، بلکہ اُسے اپنی زندگی میں پیغمبر کے بتلائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرنی ہے۔ ہمارے معاشرے میں انبیائے کرام علیہم السلام سے تعلق غلط بنیادوں پر استوار ہے۔ نماز، روزہ میں تو پیغمبر کی تابعداری لازمی سمجھتے ہیں، لیکن انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خود کو آزاد تصور کرتے ہیں۔ یہ وہ غلط، بے بنیاد اور ادھورا تصور ہے جو ہمارے ہاں اکثر حلقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مقام نبوت سے ناواقف اور

سنت و حدیث کی حجیت سے انکار کرتے ہیں اور جن پر مسیحی مذہب کے تصورات کا اثر اور مغربی طرز فکر کا غلبہ ہے۔

اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام پوری انسانیت کے لئے اسوۂ کامل، اعلیٰ قابلِ تقلید نمونہ اور اخلاق، ذوق ورجحان، ردو قبول کے بارے میں سب سے مکمل اور آخری معیار ہوتے ہیں۔ ان کے اخلاق وعادات اور ان کی زندگی کا طور وطریق سب اللہ کی نظر میں محبوب ہیں۔ ان کا طریقِ حیات، اخلاق و عادات اللہ کے نزدیک پسندیدہ بن جاتی ہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام جس راستے کو اختیار کرتے ہیں وہ راستہ اللہ کے ہاں محبوب ہوتا ہے اور اس کو دوسرے راستوں پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے۔ ان کا اختیار کرنا اور ان کے اخلاق کی جھلک پیدا کرنا اللہ کی محبت ورضا سے سرفراز ہونے کا قریب ترین اور سہل ترین راستہ ہوتا ہے۔ لہٰذا خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلایا گیا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

[آل عمران: ۳۱]

"(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔"

معجزات:

انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاتھوں پر بعض اوقات ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو کسی بھی عام انسان کے لئے حیران کن اور صلاحیتوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ایسے واقعات کو معجزات کہتے ہیں۔ یہ معجزات کسی بھی نبی کا ذاتی فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے صادر ہوتا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی سچائی ظاہر کرتا ہے۔ معجزہ انسانی ضروریات میں سے ہے کیونکہ انسانوں میں بعض اس درجہ کم فہم ہوتے ہیں جو کسی پیغمبر کی نبوت کے تبھی قائل ہوتے ہیں جب اس کے ہاتھوں پر بعض ایسے غیر معمولی واقعات ظاہر ہوں، البتہ جو لوگ ذکی اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں اُن کے لئے پیغمبر کی زندگی اور اس کا پیغام ہی ایک بہت بڑا معجزہ ہوتا ہے۔

بہر حال معجزہ نبوت یا رسالت کے لئے شرط یا ضرورت نہیں بلکہ کم فہم انسانوں کی ضرورت ہے۔اس لئے یہ ممکن ہے کہ کسی پیغمبر کے ہاتھ پر کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہو۔اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کے ایک رسول جن کا درجہ بڑا اور بلند ہو ان کو معجزے کم دیئے جائیں اور جن کا درجہ اتنا بلند نہ ہو اُن کی قوم میں کم فہم افراد کی کثرت کی وجہ سے معجزے زیادہ دے دیئے جائیں۔

الغرض معجزہ نہ تو نبی کا فعل ہے اور نہ نبوت کی شرط اور فضیلت کا معیار ہے بلکہ نبیوں کی سچائی کی شہادت اور نشانی کے طور پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حسبِ ضرورت اُنکے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے۔

ہمارے عقائد کی کتابوں میں معجزہ کی تعریف عام طور سے یہی کی گئی ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو اُس کے بھیجے ہوئے نبی کی سچائی اور صداقت ظاہر کرنے کے لیے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔قرآن پاک میں بھی انبیاء علیہم السلام سے اُن کے اقوام کی طرف سے معجزوں کے مطالبے اور انبیاء علیہم السلام کے جواب کا تذکرہ کچھ اس طرح موجود ہے:

وَمَاكَانَ لَنَا اَنْ نَّأْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ [ابراھیم:۱۱]

"اور ہم تمہیں اللہ کے حکم کے بغیر معجزہ نہیں پیش کر سکتے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تو بہت سارے ہیں جن کا تذکرہ احادیث کی کتابوں میں موجود ہے جسے یہاں ذکر کرنا تو مشکل ہے لیکن مشہور جن میں سے واقعہ معراج، شق القمر اور قرآن مجید جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ ہے شامل ہیں۔

عصمتِ انبیاء علیہم السلام:

انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں قرآن و سنت کی روشنی میں اہل السنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نبوت کی ڈیوٹی پر مامور ہونے سے پہلے اور اس کے بعد ہر قسم کے چھوٹے بڑے ہر طرح کے گناہوں سے پاک اور معصوم ہیں:

اَلْاَنْبِیَاءُ مُنَزَّھُوْنَ عَنِ الْکَبَائِرِ وَ الصَّغَائِرِ قَبْلَ النُّبُوَّۃِ وَ بَعْدَھَا۔ [کتب عقائد]

"انبیاء علیہم السلام نبوت سے قبل اور نبوت کے بعد تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے پاک ہوتے ہیں"

کیونکہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اللہ تعالیٰ کا پیغام اور قانون پر عمل کرنے، دعوت دینے اور نافذ کرنے کے لیے آتے ہیں اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا تابعدار بنانے اور اُس کے احکام کی نافرمانی سے بچانے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ عقلِ سلیم بھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ اگر وہ خود اللہ کے احکام پر عمل پیرا نہ ہوں اور نافرمان ہوں تو وہ دوسروں کو کیا اللہ کا تابعدار بنائیں گے؟ بہر حال انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے تابعدار، وحی اور احکام کے پابند، گناہوں سے معصوم، اعمال شیطانی اور خواہشاتِ نفسانی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف و برعکس عقیدہ رکھنا صریحاً گمراہی ہے۔

ختمِ نبوت:

حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اپنے اختتام کو پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جامع، مکمل اور ہمیشہ رہنے والی شریعت اور کتاب یعنی قرآن مجید نازل ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حقیقی، بناوٹی، ظلّی یا بروزی کسی قسم کا دوسرا نیا نبی مبعوث نہیں کیا جائے گا۔ قیامت کے قریب عیسیٰ علیہ السلام کی آمد نئے نبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی کی حیثیت سے ہوگی۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ قرآن و سنت سے ثابت ہے اور اس پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور علمائے امت کا اجماع ہے۔ لہٰذا جو کوئی ختمِ نبوت کا منکر یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا مدعی ہو جیسے غلام احمد قادیانی وغیرہ وہ قرآن، حدیث اور اجماع امت کا منکر اور کافر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَ لٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا [احزاب: ۴۰]

"لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کر دینے والے) ہیں اور خدا ہر چیز سے واقف ہے"۔

لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی کیونکہ نبی کے بھیجنے کے لیے قرآن نے صرف چار صورتیں اور حالات بیان کی ہیں۔ جس کی بناء پر انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں۔

اول: یہ کہ کسی قوم میں پہلے کوئی نبی نہ آیا ہو یا کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی ان تک نہ پہنچ سکا ہو۔

دوم: نبی کی ضرورت اُس وقت ہوتی ہے کہ گزشتہ نبی کی تعلیم بھلادی گئی ہو یا اس میں تحریف ہو گئی ہو اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم: پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم و ہدایت مکمل نہ ہوں اور تکمیل دین کے لیے مزید انبیاء کی ضرورت ہو۔

چہارم: کسی ایک نبی کے ساتھ اُس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام قوموں کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں اور آج کرۂ ارض پر کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام نہ پہنچا ہو، لہٰذا اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاء آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اور اس پر بھی قرآن، حدیث اور سیرت گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم اور کتاب بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہیں اِن میں کوئی تبدل و تحریف نہیں ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہو سکتا ہے، اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دین کی تکمیل کر دی گئی لہٰذا تکمیل دین کے لیے بھی اب مزید کوئی نبی درکار نہیں رہا۔ اور چوتھی ضرورت بھی باقی نہ رہی، کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی دوسرے نبی کی مدد اور نصرت درکار ہوتی تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آتا اور ظاہر ہے کہ جب کسی اور نبی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مقرر نہیں کیا گیا تو اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد

ضرورت ہی نہ رہی۔ اب وہ پانچویں وجہ کونسی ہے جس کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر نبی کی ضرورت ہے تو ہم اُس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے دنیا میں نبی کب آیا ہے، اصلاح کے لیے تو صرف مصلحین اور مجددین کی ضرورت پڑتی ہے۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ امت کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اس امت کا ایک دائمی اور عالمگیر برداری بننا ممکن ہوا ہے اور اس چیز نے مسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفریق کا موجب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ختمِ نبوت اس امت کے لیے اصلاح کی بجائے لعنت اور افتراق وانتشار کا سبب ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ جتنے انبیآء علیہم السلام دنیا میں آئے سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے، تمام دنیا میں اپنی عمر اور ڈیوٹی پوری کرکے وفات پاگئے ہیں۔ وفات کے بعد ان تمام انبیائے کرام علیہم السلام کو ایک خاص قسم کی اعلیٰ زندگی حاصل ہے جو نہ دنیاوی حیات ہے اور نہ مکمل طور پر اخروی بلکہ وہ برزخی حیات ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد دنیا میں بہترین اور کامل ترین لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کی جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم ہی ہیں۔ یہ حضرات دین کی بنیاد اور اسلام کی پہلی تعلیم یافتہ نرسری ہیں جن کی تربیت براہِ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے انہی حضرات کو چن کر انہیں امت کے لیے اتباع کا نمونہ بنایا۔ اگر قرآن وسنت نے من حیث الجماعت کسی کی تقدیس کی ہے تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کی جماعت ہے۔ اس لیے کہ اِن کو مجموعی طور پر کامل ایمان والے، ہدایت یافتہ، جنتی، راضی ومرضی اور راشد ومرشد فرمایا ہے۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا [انفال: ۴]

"یہی لوگ [صحابہ کرام رضی اللہ عنہم] سچے اور پکے مسلمان ہیں"۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ [البقرہ: ۵] "یہی لوگ کامیاب ہیں"۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ۔ "یہی لوگ رُشد وہدایت والے ہیں"۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ [توبہ: ۱۰۰]

"اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے راضی ہیں"۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ [مومنون: ۱۱]

"یہی لوگ جنت فردوس کی میراث حاصل کرنے والے ہیں"۔

امت مسلمہ کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عَدُوْلٌ تمام کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عادل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اجماع شرعی حجت ہے۔ ان کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے اور انہی کی اتباع امت مسلمہ کو ہر گمراہی سے بچا سکتی ہے۔ یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان قرآن، احادیث صحیحہ اور سیرت سے ہی پہچانی اور معلوم کی جا سکتی ہے۔ جن لوگوں نے اس معیار کو چھوڑ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تاریخی روایتوں کی روشنی میں پرکھا ہے تو وہ گمراہ ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس معاملے میں عام دنیا کے افراد ورجال کی طرح نہیں کہ ان کا مقام یا ان کے متعلق فیصلہ نری جھوٹی سچی تاریخ اور اس کے بیان کردہ حالات کے تابع کیا جائے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایسے مقدس گروہ کا نام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام امت کے درمیان اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ایک واسطہ ہیں، جس کی وجہ سے وہ ایک خاص مقام اور عام امت سے ایک بہت بڑا امتیاز رکھتے ہیں۔ اس واسطے کے بغیر نہ تو امت کو قرآن ہاتھ آسکتا ہے، نہ قرآن کے وہ مضامین جن کو قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر چھوڑا ہے، نہ رسالت اور اس کی تعلیمات کا کسی کو اِس واسطے کے بغیر علم ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ان کے عدول ہونے اور معیار ایمان ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ یہ قدوسی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ساتھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو تمام دنیا میں پھیلانے والے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے زن وفرزند اور اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پر اپنی جانیں قربان کرکے دنیا کے گوشہ

گوشہ میں پھیلانے والے ہیں۔اِن کی سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک جزء ہے۔ یہ عام دنیا کی طرح صرف کتب تاریخ سے نہیں پہچانے جاتے جیسا کہ روافض اور دشمنانِ صحابہؓ کی یہ روش ہمیشہ سے رہی ہے، بلکہ یہ عظیم الفطرت ہستیاں نصوص قرآن وحدیث اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

ان کو تاریخ کی صحیح وسقیم روایات کے انبار میں گم نہیں کیا جا سکتا اگر کوئی روایت ذخیرۂ حدیث میں بھی ان کے اِس مقام اور شان کو مجروح کرتی ہو تو وہ بھی قرآن وسنت کی نصوص صریحہ اور اجماع امت کے مقابلہ میں متروک ہو گئی۔ تاریخی روایات کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔؟

سلف صالحین وائمہ مجتہدینؒ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قرون اور زمانوں کو خیر کا زمانہ کہا ہے۔پہلا دور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دوسرا تابعین رحمہم اللہ اور تیسرا تبع تابعین رحمہم اللہ کا، اِن کو خیر القرون کہا جاتا ہے۔ یہ حضرات بھی دین میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔اُن میں ائمہ حضرات مجتہدین ہیں، جنھوں نے قرآن وسنت کی تشریح اور فروعی مسائل میں اجتہاد کرکے امت پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے کیونکہ کچھ مسائل تو وہ ہیں جو قرآن یا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں صاف طور پر موجود ہیں ان کے بارے میں تو اجتہاد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ان کے علاوہ بہت سے ایسے حوادث اور واقعات پیش آتے ہیں جن کا حکم قرآن یا حدیث میں صاف طور نہیں ملتا تو اِن کے بارے میں مجتہدین کو اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے، یعنی ان حضرات نے قرآن وحدیث سے تشریح اور قانون سازی کے جو اُصول اور اس کی جو بنیادیں سمجھی ہیں وہ ان سے اِن نئے حوادث اور واقعات کا حکم نکالتے ہیں۔ حدیث میں بھی آتا ہے کہ:

عَنْ مَعَاذٍ اَنَّ النَّبِیَّ لَمَّا بَعَثَهٗ اِلَی الْیَمَنِ قَالَ اَرَاَیْتَ اِنْ عُرِضَ لَكَ قَضَاءٌ كَیْفَ تَقْضِیْ قَالَ اَقْضِیْ بِكِتَابِ اللهِ، قَالَ فَاِنْ لَمْ یَكُنْ فِیْ كِتَابِ اللهِ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ قَالَ فَاِنْ لَمْ یَكُنْ فِیْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ قَالَ اَجْتَهِدُ رَاْیِیْ۔ [سنن دارمی: ۱/ ۷۱، احمد، ترمذی]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی اور والی بنا کر بھیجا تو اُن سے دریافت کیا کہ تمہارے سامنے جو مقدمات اور مسائل آئیں گے اُن کا فیصلہ تم کس طرح کیا کروگے ؟ انھوں نے عرض کیا کہ پہلے تو میں کتاب اللہ کی طرف اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل اور آپ کے ارشادات اور فیصلوں کی طرف رجوع کروں گا اور اگر دونوں جگہ سے مجھے اس معاملے کا حکم نہیں ملا تو پھر میں اجتہاد کروں گا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اس جواب سے بہت خوش ہو کر انھیں شاباش دی اور اللہ کی حمد اور شکر ادا کیا۔

یہ حدیث مجتہدین کیلئے بنیاد اور دلیل ہے۔ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت کا شرف حاصل ہوا وہ سب حسبِ ضرورت اجتہاد فرماتے تھے، پھر پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی کے اوائل میں خصوصاً اور اس کے بعد کے زمانے میں عموماً ایسی بہت سی ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنی زندگی کا سرمایہ اس کام پر لگا دیا انھوں نے دین کی یہ خاص خدمت کی کہ قرآن وحدیث میں اور فقہاءِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرز عمل میں غور کرکے تشریح کے اصول نکالے اور پھر ان کی روشنی میں ان نئے مسائل کا حکم دریافت کرنے کی کوشش کی، جن کا قرآن وحدیث میں واضح بیان ہمیں نہیں ملتا سو اس طرح شریعت اسلامی کی فقہ مرتب اور مدون ہوئی۔ دین کی یہ خدمت اور کوشش ویسے تو بہت سے مجتہدین نے کی تھی، لیکن ان میں سے آئمہ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ) کی فقہ غالباً زیادہ مرتب اور جامع ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول ہوئی۔

اجتہاد کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ ہر ایک کا کام نہیں۔ جن بزرگوں نے یہ کام کیا، ان کا قرآن وسنت کا علم نہایت ہی وسیع اور باریک بینی پر مبنی تھا۔ انھوں نے اِن لوگوں کو دیکھا، بلکہ اِن ہی سے علم دین حاصل کیا تھا جنھوں نے دینی تعلیم وتربیت براہ راست صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یا اُن کے خاص شاگردوں سے حاصل کی تھی۔ پھر اِس مستند و وسیع علم اور اس تعلیم وتربیت کے علاوہ ان میں تعلق باللہ اور تقویٰ اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دراصل یہ کام انہی کا تھا جن سے اللہ تعالیٰ نے لیا، لیکن آج اجتہاد کو ایسی معمولی بات سمجھ لی گئی

ہے کہ بعض لوگ دین سے متعلق اردو کے چند رسالے پڑھ کر یا زیادہ سے زیادہ قرآن وسنت کے چھپے ہوئے ترجمے دیکھ کر ہی اپنے آپ کو اجتہاد کا حق دار سمجھنے لگ جاتے ہیں اور مسائلِ شرعیہ میں اپنے گمان میں بالکل مجتہدانہ انداز میں رائے زنی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

ضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا [صحیح بخاری و مسلم، مشکوۃ]

"وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں"۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین وآئمہ مجتہدینؒ کا تذکرہ عقیدۂ رسالت کے ساتھ ضمناً کیا گیا ہے۔

ملائکہ پر ایمان:

ایمان کے سلسلے میں فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تابعدار مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بعض کاموں پر مامور کیا ہے جو وہ اللہ کے حکم کے مطابق چلاتے اور نافذ کرتے ہیں۔ فرشتے انسانوں کی مانند اپنے ارادہ واختیار سے کوئی کام نہیں کرتے، بلکہ وہ امر اللہ پر مجبور محض ہیں یعنی اللہ کے حکم کے مطابق ہی چلتے اور کام کرتے ہیں نافرمانی ہر گز نہیں کرتے۔

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ [تحریم:٦]

"اللہ تعالیٰ اِن کو جو حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے"۔

فرشتوں کے بارے میں بھی لوگوں میں افراط و تفریط موجود ہے، کسی نے ان کو اللہ تعالیٰ کا نائب اور بیٹیاں سمجھا تو کسی نے اِن کی معصومیت وبزرگی سے انکار کیا اور کسی نے تو سرے سے ان کے وجود کا ہی مطلقاً انکار کر دیا۔ اسلام نے اس افراط و تفریط کو غلط قرار دے کر انکی صحیح حیثیت کو واضح کر دیا کہ ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا نائب وحصہ دار نہیں اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹیاں ہیں کیونکہ ان میں نر اور مادہ نام کی کوئی جنس نہیں بلکہ یہ تمام نورانی مخلوق ہے۔

کتابوں پر ایمان:

ہر قوم یا ملک کا اپنی قوم و ملک میں زندگی گزارنے اور اپنے درمیان پیش آنے والے معاملات کے حل کے لیے ایک آئین، دستور اور قانون ہوتا ہے جس کے وہ قبیلے، قوم اور ملک والے پابند ہوتے ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی انسانیت کی ہدایت اور دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے وقتاً فوقتاً اپنا قانون، آئین اور دستور حیات کتابوں کی شکل میں مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمایا ہے۔ جن میں چار بڑی کتابیں تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، زبور حضرت داود علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور آخری وابدی کتاب قرآن کریم جناب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے۔اِس کے علاوہ بہت سے صحیفے بھی مختلف انبیائے کرام پر نازل ہوئے جیسے آدم علیہ السلام، ابراھیم علیہ السلام وغیرہ پر نازل ہوئے ہیں۔ یہ صحیفے چھوٹے چھوٹے کتابچوں اور پاروں کی مانند تھے جس میں نصیحت کی باتیں اور ذکر واذکار تھے۔ اِن چار کتابوں میں اس کے علاوہ زندگی گزارنے کے قوانین بھی موجود ہیں۔ یہ تمام کتابیں اپنے اپنے زمانے میں ہدایت کے سرچشمے تھے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ہدایت کا اصل منبع ہوتے تھے، لیکن قرآن کے علاوہ باقی کتابوں میں لوگوں نے تحریف کی جو اب اصل شکل میں ملنا مشکل ہیں۔ صرف قرآن تا قیامت غیر محرف اور جامع کتاب ہے جو ہر دور کے لیے یکساں قانون حیات ہے۔اب عمل صرف قرآن پر ہو گا کیونکہ وہ ہدایت کا وہ واحد ذریعہ ہے جس میں مکمل دین اسلام اور انسانی زندگی کی ضروریات کا حل موجود ہے۔ باقی آسمانی کتابوں پر صرف ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ قرآن جیسے مکمل آئین آنے کے بعد ان کتابوں پر عمل کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ پس قرآن کے علاوہ تمام کتابیں اور شریعتیں منسوخ ہو گئیں ہیں جس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک ملک ہے اس کے رہنے والے بہت کمزور اور پست حالت میں ہیں، غربت بھی ہے، جہالت بھی، صحتیں بھی خراب ہیں، تو حکومت ان کے لئے بہت ہلکے قوانین مقرر کرتی ہے اور بہت سی رعایتیں اور سہولتیں دیتی ہے۔ لیکن جب کچھ عرصے کے بعد ملک ترقی کر جاتا ہے اور لوگوں کی حالت کچھ اچھی ہو جاتی ہے تو پھر اس حالت کے مطابق نیا قانون بنا دیا جاتا ہے۔ اب اس نئے قانون کے

بعد اگر کوئی شخص پہلے قانون پر چلے اور نئے قانون کو نہ مانے تو وہ مجرم اور سزا کے قابل ہوگا، کیونکہ وہ حکومت کی نافرمانی کرتا ہے اور حکومت کے امتیازی اختیارات خود استعمال کرنا چاہتا ہے۔

بس انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی شریعتوں کا حال بھی ایسا ہی سمجھ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم اور کسی زمانے کے لوگوں کی حالت کے مطابق اپنے کسی پیغمبر کے ذریعے ایک قانون بھیجا، پھر ایک مدت بعد جب حالات کچھ بدل گئے اور دوسرے پیغمبر کو بھیجا گیا، تو قانون میں بھی کچھ تبدیلی کر دی گئی، تو اس وقت بندوں کا فرض یہ ہے کہ ایمان تو پہلے پیغمبروں پر بھی لائیں اور احترام سب کے لائے ہوئے قوانین کا کریں کیونکہ یہ سب اللہ ہی کے قوانین ہیں، لیکن پیروی اور پابندی قرآن کر کرنی پڑے گی۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَوْكَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِي [مشکوۃ]

"یعنی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر موسیٰ علیہ السلام بھی اگر آج زندہ ہوتے تو وہ بھی میری ہی شریعت کی پیروی کرتے۔"

یہی وجہ ہے کہ آخری زمانے میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام صحیح احادیث کی اطلاع کے مطابق اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو اُن کا عمل شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہی پر ہوگا کیونکہ اس زمانے اور اس دور کے لئے حکمِ الٰہی یہی ہے اور پہلی شریعتوں اور پہلے الٰہی قوانین کو خود اللہ تعالیٰ نے منسوخ قرار دے دیا ہے۔ اب اُن پر چلنا گویا اللہ کی نافرمانی ہے۔

تقدیر پر ایمان:

ہر مسلمان کے لیے تقدیر پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ تقدیر کا لفظی معنیٰ اندازہ کرنے کے ہیں، جبکہ شریعت کی اصطلاح میں تقدیر اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کو کہتے ہیں جو اُس نے کائنات اور اِس کے اندر ساری مخلوقات خصوصاً انسان کے بارے میں کر دیا ہے یا آئندہ کرے گا۔ تقدیر کی مثال ایسی ہے کہ جب کوئی انسان مکان بناتا ہے تو پہلے وہ زمین یا کاغذ پر اس کا ایک نقشہ بنا لیتا ہے کہ اس مکان میں جتنے کمرے، برآمدے بنانے ہوتے ہیں، جتنے دروازے کھڑکیاں لگانی ہوتی ہیں، غسل خانے اور باورچی خانے بنانے ہوتے ہیں ان سب کی جگہ پہلے

سے مقرر کر دی جاتی ہیں۔ پھر اس بنے ہوئے نقشے کے مطابق پورا مکان بنایا جاتا ہے اور کبھی ضرورت ہوتی ہے تو اِس میں آدمی جزوی ترمیم بھی کر لیتا ہے مگر اصل نقشہ وہی ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جب اس پوری کائنات اور انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے کچھ اصول، کچھ قاعدے بنا دیے ،ہر مخلوق پر اس کی فطرت کے مطابق کام اور ذمہ داری مقرر کر دی۔ اب اسی اصول اور فطرت کے مطابق اس پوری کائنات کا نظام چل رہا ہے اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا، اب اس میں اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا کسی طرح کی کوئی تبدیلی یا ایک سیکنڈ کے برابر کا فرق نہیں لا سکتا۔ سورج چاند کا نکلنا، دن رات کی آمد و رفت ،زمین کی گردش، ہوا پانی اور فضا کی کیفیت وافادیت ،انسان کے جسم کی ساخت اس کے اعضاء کی مختلف صلاحیتیں اس کی زندگی اور موت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ذرہ بھر تبدیلی نہیں کر سکتا۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سورج کے طلوع و غروب، ان کے حرکت کرنے میں اور زمین کی گردش میں اگر ایک سیکنڈ تک کا فرق لانا چاہے تو نہیں کر سکتی۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر آنکھ سے بولنے، زبان سے دیکھنے، کان سے سونگھنے کا اور ناک سے سننے کا کام لینا چاہے تو یہ کام وہ نہیں لے سکتا، اللہ تعالیٰ نے جس کو جس کام پر لگا دیا ہے وہ ایک بال کے برابر اپنے کام سے نہیں ہٹ سکتا۔ غرض یہ کہ یہ سب کچھ اللہ کے بنائے ہوئے قاعدے اور اصول وضوابط کے تحت ہو رہا ہے اس میں وہی جو چاہے تبدیلی کر سکتا ہے دوسرا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ انسان بالکل مجبور محض ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہر اچھے برے ارادے کا مالک اور کام کرنے کا اختیار دیا ہے اور ساتھ یہ بھی اپنی کتابوں اور انبیائے کرام علیہم السلام کے ذریعے بتایا ہے کہ یہ کام اور تمہارے فائدے اور یہ نقصان دہ ہیں۔ انسان اور دوسری مخلوقات میں بنیادی فرق یہی ہے کہ دیگر مخلوقات کو کسی قدر ارادہ اور اختیار تو دیا گیا ہے لیکن عقل و شعور اور فکری قوت سے انہیں محروم رکھا ہے جبکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ارادہ واختیار کے ساتھ ساتھ عقل وشعور اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی دی ہے۔ اب وہ اپنے ارادے اور اختیار سے اچھے کام بھی کرتا ہے اور برے کام بھی کرتا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کو ماضی حال اور مستقبل کا علم ہے لہٰذا وہ اِس علم کے مطابق کہ فلاں آدمی یہ نیک کام اپنے ارادے سے کرے گا یا فلاں برا کام

قتل وزنا وغیرہ اپنے ہی ارادے سے کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ فعل پہلے سے اپنے علم ازلی کے مطابق لکھا ہوا ہے۔ گویا کہ تقدیر صرف یہی نہیں ہے کہ فلاں شخص فلاں اچھا یا برا کام کریگا بلکہ تقدیر میں پوری بات یوں ہے کہ فلاں شخص اپنے ارادہ واختیار سے ایسا کرے گا پھر اس سے یہ نتائج پیدا ہوں گے اور پھر اس کو یہ جزا یا سزا ملے گی لہٰذا تقدیر کی وجہ سے نہ تو ہم مجبور ہیں اور نہ ہمارے اعمال کی ذمہ داری اللہ پر آتی ہے۔ ایسے ہی جن مقاصد کے لیے ہم جو کوششیں اور جو تدبیریں اس دنیا میں کرتے ہیں، تقدیر میں بھی ہمارے ان مقاصد کو ان ہی تدبیروں اور کوششوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔ تقدیر میں صرف یہ نہیں ہے کہ فلاں شخص کو فلاں چیز حاصل ہو جائے گی بلکہ جس کوشش اور جس تدبیر سے وہ چیز اسی دنیا میں حاصل ہونے والی ہوتی ہے، تقدیر میں بھی وہ اسی تدبیر سے بندھی ہوئی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ تقدیر دو طرح کی ہوتی ہے ایک "تقدیر مُبرم" دوسری "تقدیر مُعَلّق"۔ تقدیر مبرم تو اٹل ہوتی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں البتہ تقدیر معلق کا تعلق عام طور سے انسان کے اعمال اور دعاؤں سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے اچھے یا بُرے کام کے نتیجے میں یا پھر اس کی دعا سے اس میں تبدیلی کر دیتا ہے۔

آمدم بر سرِ مطلب یہ چند اہم عقائد تھے جن کا بیان مختصر طور پر کہا گیا۔ اب اگر کوئی مسلمان ان بنیادی اُمور یعنی عقائد کا انکار کرے یا ان میں شک کرے یا کسی ایسے فرض سے انکار کرے جس کے فرض ہونے پر پوری امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے یا کسی ایسے حرام کام کی حرمت سے منکر ہو جسے سب مسلمان حرام مانتے ہیں یا قرآن مجید کا انکار کرے خواہ یہ انکار ایک کلمہ کا ہی کیوں نہ ہو، تو دین سے خارج ہو جائیگا اور مرتد قرار پائیگا۔ مرتد ہونا اسلامی نقطہ نگاہ سے سب سے بڑا جرم ہے۔ یہ اسی طرح کا جرم ہے جیسا کہ موجودہ قوانین کی رو سے خیانتِ عظمیٰ یعنی قومی یا ملکی رازوں کی چوری یا ملک وقوم سے غداری وغیرہ۔ مُرتد اگر توبہ نہ کرے اور اپنے جرم پر ڈٹا رہے تو اس کی سزا موت ہے۔ اسی طرح ایمان تقسیم نہیں ہو سکتا اگر ایک مسلمان ننانوے (۹۹) عقیدوں پر ایمان رکھتا ہے اور ایک کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر ہو جائیگا۔ چونکہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے تمام ایمانیات اور ضروریاتِ دین پر ایمان لانا ضروری ہے، لیکن

اسلام سے خارج ہونے اور کافر بننے کے لیے ان تمام کا منکر ہونا ضروری نہیں بلکہ کافر ہونے کے لیے ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کافی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص بظاہر مسلمان ہو لیکن درحقیقت بے ایمان ہو، جیسے کوئی شخص کسی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے، اس کے اجتماعات میں شرکت کرتا ہے لیکن درحقیقت اُس نے اِس کے اُصولوں کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہوتا اور ان کے صحیح ہونے کا دل سے قائل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس جماعت میں جاسوسی یا کسی ذاتی و دنیاوی مفاد کی غرض سے یا اس کے کاموں کو بگاڑنے کے لیے شامل ہوتا ہے۔ ایسے مسلمان کو منافق کہا جائیگا جو زبان سے تو کلمہ طیبہ پڑھتا ہے، نماز روزے کا پابند ہے، لیکن دل سے مومن نہیں ۔ اگرچہ بظاہر اور دنیوی اعتبار سے ہم اسے مسلمان ہی کہیں گے۔ اس لیے کہ انسان تو کسی کی ظاہری حالت ہی دیکھ کر ہی اس کے متعلق اپنا فیصلہ دینے پر مکلّف ہو سکتا ہے دلوں کے بھید تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

اسلام کا نظامِ عبادات

Islamic Worships System

اسلامی نظامِ عبادات دین ومذہب کی بنیادی ضرورتوں میں ایک لازمی امر ہے جو عقیدے کی درستگی کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ جس سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے ذریعے بندہ اللہ تعالیٰ کی رضاورحمت کا طلب گار بن کراُس کی توحید والوہیت اور اپنی بندگی کا عملی اظہار کرتا ہے۔ عبادات اس نظریئے اور عقیدۂ توحید کا عملی ثبوت ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق، مالک اور حاکم مانتا ہوں اس لیے اس کے سامنے سر بسجود ہوں، اس کے حکم کے مطابق اپنی جان اور مال قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔

جیساکہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات، ذکر، دعا، تلاوت، جہاد وقربانی وغیرہ یہ ساری عبادت واعمال روح کی پاکیزگی وتقربِ الٰہی حاصل کرنے اور اللہ کی معبودیت، عظمت وکبریائی کی گواہی دینے کے لیے ادا کی جاتی ہیں۔ اسلام کا نظامِ عبادات تین قسم کی عبادات پر مشتمل ہے ایک خالص جسمانی عبادات جیسے رکوع، سجدہ، اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف، نماز اور روزہ وغیرہ ۔دوسری خاص مالی عبادات جیسے انفاق فی سبیل اللہ، صدقہ وخیرات، زکوٰۃ، نذر اللہ اور قربانی وغیرہ ۔اور تیسری قسم عبادت دونوں (مال وجان) سے مرکب جیسے حج، عمرہ، جہاد وغیرہ ۔ اجمالی خاکے کے بعد چند اہم عبادات پر مختصر بحث ہدیۂ قارئین ہے۔

نماز:

نماز ایسی عبادت ہے کہ تمام آسمانی ادیان میں اس کا حکم تھا جیسے کہ علماءؒ فرماتے ہیں۔

كَانَتِ الصَّلٰوةُ لِجَمِيْعِ الْاُمَمِ۔

"نماز تمام امتوں میں مروج تھی"

اسی طرح شریعت اسلامیہ میں بھی اسلامی عقائد جیسے توحید، رسالت وآخرت وغیرہ کی شہادت دینے کے بعد سب سے پہلا اور سب سے اہم فریضہ جو بندہ پر اللہ کی طرف سے عائد کیا

گیا ہے وہ نماز ہے۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ ایمان وتوحید کے بعد اولین عملی فریضہ کی حیثیت سے نماز ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ۔ [بقرہ: ۳]

"یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ایسے لوگ ہیں کہ یقین کرتے ہیں اَن دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو"۔

بہر حال اسلام میں سب سے پہلا اور اہم مطالبہ نماز ہی کا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ اسلام میں ہر نئے داخل ہونے والے سے توحید کا اقرار لینے کے بعد نماز کا عہد لیا کرتے تھے۔

وَکَانَ النَّبِیُّ ﷺ اَوَّلُ مَا یَشْتَرِطُ بَعْدَ التَّوْحِیْدِ اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃِ [فتح الباری]

حقیقت یہ ہے کہ کلمۂ اسلام کی تصدیق، احکام الٰہی کی پابندی اور شریعت کا مکمل اتباع کرتے ہوئے ایک مومن سے جس طرح کی زندگی مطلوب ہے، نماز ہی ایسی زندگی کو مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ گویا نماز ایمان اور اسلامی زندگی کے درمیان کی کڑی ہے اس لیے اس کا درجہ ایمان کے بعد باقی سب اعمال سے پہلے ہے۔ اگر تمثیل کے طور پر ایمان کو بیج اور باقی عملی نظام کو اسکی شاخیں قرار دیں تو نماز کی حیثیت اس درخت کے تنے کی ہوگی جو خود اگرچہ بیج ہی سے پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کی قوت پر اُگنے والی تمام شاخیں اور پھول پتیاں اسی تنے سے نکلتی ہیں او راسی پر قائم ہوتی ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نماز کے بارے میں فرماتے ہیں:

اَمَّا الصَّلٰوۃُ فَھِیَ الْمَعْجُوْنُ الْمُرَکَّبُ مِنَ الْفِکْرِ الْمَضْرُوْفِ تِلْقَاءَ عَظْمَۃِ اللّٰہِ۔۔۔وَمِنَ الْاَدْعِیَۃِ الْمُبَیِّنَۃِ اِخْلَاصَ عَمَلِہٖ لِلّٰہِ وَتَوْجِیْہَ وَجْھِہٖ تِلْقَاءَ اللّٰہِ وَقَصْرَ الْاِسْتِعَانَۃِ فِی اللّٰہِ وَمِنْ اَفْعَالٍ تَعْظِیْمِیَّۃٍ کَالسُّجُوْدِ وَالرُّکُوْعِ یَصِیْرُ کُلُّ وَاحِدٍ عَضُدَ الْاٰخَرِ وَمَکَمِّلَہٗ وَلِمُنَبِّہٖ عَلَیْہِ۔

[حجۃ اللہ البالغہ۔۔۔۱/۷۳]

"نماز ایک معجون مرکب ہے جس میں حق سبحانہ و تعالیٰ کی عظمت میں غور و فکر بھی ہے اور ایسی دعائیں بھی ہیں جو عمل کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرنے اور نفس کو اللہ تعالیٰ کی

طرف متوجہ کرکے اس سے وابستہ کردیں۔ اور وہ تعظیمی افعال جیسے رکوع و سجود وغیرہ بھی ہیں جو اس حالت کے معین و مددگار ہوں"۔

اس لیے نماز ہر خاص و عام کے لیے مفید ہے اور ایسا قوی التاثیر تریاق ہے جو ہر ایک کو اس کی استعداد اور صلاحیت کی بقدر فائدہ پہنچاتا ہے اور ترقی دیتا ہے۔ نماز مومن کے لئے بمنزلہ معراج ہے جو اس کو اخروی تجلیاتِ باری کے تحمل کے لیے تیار کرتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"عنقریب تم اپنے پروردگار کی زیارت کروگے لہٰذا فجر اور عصر کی نمازوں میں کوتاہی نہ کرو۔"

نماز حق تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے اور اس کی رحمت کے نزول کے لئے بڑی تاثیر رکھتی ہے۔

الغرض نماز جملہ حالاتِ زندگی واحکامِ شریعت پر محیط ہے۔ مثلاً کھڑا ہونا، بیٹھنا، جھکنا، لیٹنا ایک حالت سے دوسری کی طرف منتقل اور متحرک ہونا تو نماز میں ان تمام حالتوں کو جمع کردیا گیا ہے۔ ہر حال میں اللہ کریم کی یاد، عظمت و کبریائی، اللہ کی اطاعت و بندگی کی مشق، توحید و رسالت کی شہادت وغیرہ یہ سب نماز میں شامل ہیں۔ علیٰ ھٰذا قبلہ رو کھڑے ہو کر ایک طرح سے حج کی یادگار ہے جو نماز کی شرط ہے، اسی طرح نماز میں کھانے پینے کی مما نعت جو روزے کا خاصہ ہے، ایسے ہی نماز کے اوقات میں اپنے کاروبار و کسب و معاش کے سلسلہ کو بند کرکے نمازی جو مالی نقصان برداشت کرتا ہے وہ نماز میں مالی قربانی (زکواۃ) کا حصہ ہے، پھر اسی طرح جماعت میں سب کے ساتھ کھڑا ہونا اور اپنی دینی حیثیت سے بزرگ تر شخص کو اپنا امام بناکر اس کی اقتدا کرنا اجتماعی زندگی کے متعلق دین کے اہم احکامات اخوت، مساوات، بڑوں کی توقیر واطاعت فی المعروف واطاعتِ الامیر، التزامِ جماعت اور نظم و نسق وغیرہ کی مشق ہے جو ہر نماز میں ہوتی ہے۔ اسی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ [حدیث] "نماز دین کا ستون ہے"۔

لَادِیْنَ لِمَنْ لَاصَلٰوۃَ لَہٗ [حدیث]

"جس شخص کی نماز نہیں اس شخص کا دین نہیں"۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں جس نے اچھی طرح وضو کیا اور ٹھیک وقت پر نمازیں پڑھیں، رکوع و سجود میں بھی خشوع و خضوع کو ملحوظ خاطر رکھا تو ایسے شخص کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسے بخش دیگا اور جس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے لیے اللہ کا کوئی وعدہ نہیں چاہے بخش دے چاہے تو سزا دے۔ [مشکوٰۃ]

روزہ:

روزہ کو عربی میں صوم کہتے ہیں جس کے معنی ہیں رُکنا، باز رہنا اور اصطلاح میں صبح صادق سے لیکر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور دیگر خواہشاتِ نفسانی سے بچے رہنے کا نام روزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ [بقرۃ: ۱۸۲]

"اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن جاؤ"۔

حدیث شریف میں ہے کہ:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ [رواہ البخاری ۲۸ و مسلم ۷۶۰]

"جس نے رمضان کے روزے محض اللہ کے لیے ایمان (صحیح عقیدہ) کی بنا پر اور احتساب (اصلاحِ نفس) کے لیے رکھے اس کے پچھلے گناہ بخش دے جائیں گے"۔

غرض روزہ رکھنے سے بے شمار جسمانی، روحانی، معاشرتی اور اخلاقی فائدے وابستہ ہیں۔ روزہ ہر سال پورے ایک مہینے تک انفرادی طور پر ہر مسلمان اور بحیثیت مجموعی مسلم سوسائٹی کو تقویٰ، ایثار، مساوات، غریبوں کے ساتھ ہمدردی، قانونِ الٰہی کی پابندی، ضبط، تزکیہ، صبر واستقلال اور محنت وجفاکشی کی تربیت دیتا رہتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (متوفی) روزے کے بارے میں فرماتے ہیں:

اَلصَّوْمُ تِرْیَاقٌ عَظِیْمٌ یَقْوِی الْاِیْمَانَ وَیَقْمَعُ اٰلَۃَ الشَّعْبَدُ وَیَنْفَعُ مِنَ الْبَلَاءِ وَ فِتْنَۃِ الْقَبْرِ وَفِتْنَۃِ جَھَنَّمَ وَیُوْصِلُ اِلَی بَابِ الرَّیَّانِ وَیَکْسِرُ حِجَابَ الطَّبْعِ کَسْرًا عَظِیْمًا۔

روزہ ایک تریاقِ عظیم ہے جو ایمان کو قوی کرتا ہے اور عبادت گزاری کا ایک بہترین طریقہ ہے جو بلا اور فتنہ قبر اور فتنہ جہنم سے حفاظت کرتا ہے اور بہشت کے خصوصی دروازہ ریان تک پہنچاتا ہے اور طبیعت کے حجاب کو پوری طرح چاک کرتا ہے۔ [البدور البازغۃ،۲۱۶]

زکوٰۃ:

زکوٰۃ کے معنی پاکیزگی کے ہیں یعنی زکوٰۃ دینے سے مال پاک ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ [بقرہ: ۴۳]

"نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔"

خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:

وَاللّٰہِ لَاُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ۔

"اللہ کی قسم جس نے نماز و زکوٰۃ میں فرق کیا میں اُس سے ضرور جہاد کرونگا۔"

بہر حال اسلام نے صاحبِ حیثیت مسلمان پر سالانہ (ایک خاص مقدار) مقرر کی ہے تاکہ مسلمانوں میں مالی ایثار کے ذریعے آپس میں ہمدردی و تعاون کا جذبہ پیدا ہو اور دولت کی گردش صرف اُمراء تک محدود نہ رہے بلکہ غرباء بھی اس سے مستفید ہوں اور باہمی طبقاتی کشمکش نہ ہو۔ فرضیتِ زکوٰۃ تہذیب نفس، اصلاحِ اخلاق، برکاتِ مال، معاشرتی برائیوں، شرورِ نفسانی اور تزکیہ مال کے ساتھ ساتھ اور غرباء سے تعاون کے لیے ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ زکوٰۃ کی مصلحتوں کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں: "زکوٰۃ کی فرضیت میں دو مصلحتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ایک مصلحت مال کا تزکیہ نفس اور تہذیبِ نفس ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ سے بخل کا ازالہ ہوتا ہے اور بخل سب سے بری عادت ہے جس کی وجہ سے آدمی آخرت میں نقصان و ضرر میں رہتا ہے۔ بخیل آدمی جب مرتا ہے تو اس کا دل مال میں اٹکا رہتا ہے جس کی وجہ سے

اس کو عذاب دیا جاتا ہے اور جو شخص زکوۃ دینے کا عادی ہوتا ہے اور اس کے ذریعے سے بخل کا مادہ نکال دیتا ہے تو یہ اس کے لیے نفع بخش ہوتا ہے۔ آخرت میں انابت الی اللہ کے بعد سب سے زیادہ سود مند عادت سخاوتِ نفس ہے۔

دوسری مصلحت کا مآل شہری ملی اور قومی منافع ہیں اور یہ ہے کہ شہر اور قوم میں لامحالہ کمزور اور حاجت مند لوگ بھی ضرور ہوتے ہیں، حوادث زمانہ ایک قوم پر آتے ہیں اور دوسری قوم پر گزر جاتے ہیں اگر ان میں فقراء و مساکین اور اصل حاجات کی ہمدردی اور خیر خواہی کا دستور نہ ہوگا تو وہ لوگ ہلاک ہوں گے اور فقر وفاقہ سے مریں گے اور نیز ملکی اور قومی نظام بھی مال اور سرمایہ پر موقوف ہے جس سے محافظین اور مدبرین وسیاسیین اور حکام وعمال کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ جب یہ لوگ ملک اور قوم کے کاموں میں مشغول ہیں اور کسبِ معاش چھوڑے ہوئے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کی معیشت کا بوجھ بھی قوم ہی پر پڑے اور مشترک اخراجات کا تحمل بعض کے لیے آسان نہیں ہوتا اور بعض لوگ اس پر قادر نہیں ہوتے تو ضروری ہوا کہ رعایا سے اموال جمع کئے جانے کا کوئی دستور و قاعدہ ہو۔ جب کہ یہ امر دشوار تھا اور مصلحت کے موافق نہ تھا کہ ایک مصلحت کو دوسری مصلحت کے ساتھ ملایا جائے تو شریعت نے ایک کو دوسرے میں داخل کر دیا۔

پھر ضرورت اس کی پیش آئی کہ زکوۃ کی مقدار متعین کر دی جائے، اگر یہ تعیین نہ ہوتی تو اس کی ادائیگی میں افراط و تفریط سے کام لیا جاتا اور ظالم اپنے پر ظلم کرتا اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مقدار نہ اتنی کم ہو جس کی پروانہ ہو اور بخل کا ازالہ نہ کرے اور نہ اتنی زیادہ ہو کہ ادائیگی ان کے لیے دشوار ہو جائے اور مدت اتنی طویل بھی نہ ہو جس سے بخل کا ازالہ نہ ہو سکے اور محتاج لوگوں کو طویل انتظار کرنا پڑے۔ موافق مصلحت یہی تھا کہ اس کے لیے وہ مدت رکھی جائے جس میں سلاطین اپنی رعایا سے عموماً ٹیکس وصول کرتے ہیں۔

[حجۃ اللہ البالغہ جلد اول، ۳۶]

حج :

حج اسلام کے اہم ارکان میں سے ہے جو صاحبِ استطاعت پر عمر بھر میں ایک بار فرض ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے :

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلاً وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ

[آل عمران : ۹۷]

"اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمے اس کے مکان کا حج کرنا ہے"۔

حدیث شریف میں ہے کہ :

مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلَى بَيْتِ اللهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا، أَوْ نَصْرَانِيًّا۔

"جس کے پاس سفر حج کا ضروری سامان ہو اور اس کو سواری میسر ہو جو بیت اللہ تک اس کو پہنچا سکے اور پھر بھی وہ حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر"۔

حج اسلامی مساوات کا نمونہ ہے، امیر غریب، بادشاہ، فقیر سب ایک لباس (احرام) میں ملبوس ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ سال میں ایک بار دنیا کے کونے کونے سے مسلمان جمع ہو کر مسلمان اپنے ملی تشخص، اتحاد واتفاق و مرکزیت کا عملی ثبوت دیتے ہیں اور اس کے ذریعے ایک دوسرے سے مل کر اخوت و ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ الغرض حج بیت اللہ کی چار اہم حکمتیں ہیں۔

ا۔ فرشتوں کے ساتھ مشابہت :

حج کے ایام میں حاجی کو حیوانیت اور نفسانیت کی ساری خصلتوں کو بالکل ترک کرنے کا حکم دیا گیا اور جوہرِ انسانیت کو نمایاں کر کے فرشتوں کے ساتھ مشابہت اور مسابقت کا پورا موقع فراہم کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللهُ [بقرۃ: ۱۹۷]

"حج کے مہینے مقرر ہیں اس لئے جو شخص ان میں حج لازم کرلے وہ اپنی بیوی سے میل ملاپ کرنے، گناہ کرنے اور لڑائی جھگڑے سے بچتا رہے۔"

۲۔ بندگی کا اجتماعی اعتراف واعلان:

ازل میں اللہ تعالیٰ نے تمام ارواحِ انسانی سے میدانِ عرفات میں اپنی ربوبیت اور وحدانیت کا اقرار لیا تھا کہ وہ دنیا میں پوری زندگی کو بندگی کے ساتھ اطاعت وفرمانبرداری میں گزاریں اور یہی ایمان کا اصل تقاضا ہے۔ اب ہر سال حج کے موقع پر عرفات میں اس سالانہ عظیم الشان ملی اجتماع سے مقصد اس اعتراف واقرار اور عہد کی یاد دہانی ہے، اور خداپرستوں کی جانب سے اسی عہد واقرار کی پاسداری اور ادائیگی ہے۔

۳۔ سفر آخرت کی یاد دہانی:

سفر حج درحقیقت سفر آخرت کی یاد دہانی ہے۔ سفر حج کے ہر ہر موقع پر سفر آخرت کا نمونہ نظر آتا ہے۔ حج کے ارادے سے گھر سے نکلتے وقت تمام عزیز واقارب اور دوست واحباب اور مال ودولت کو چھوڑ کر پردیس کا رخ کرنا گویا موت کی یاد ہے کیونکہ مرتے وقت یہ سب کچھ چھوڑ کر آخرت کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ احرام باندھنا کفن کی یاددہانی ہے۔ بیت اللہ کا طواف آخرت میں دیدار الٰہی کی یاد دلاتا ہے۔ صفا مروہ کے درمیان پریشانی کی حالت میں سعی کرنا قیامت کے دن قبروں سے پریشان حالی کی حالت میں اٹھنے کو ظاہر کرتا ہے۔ عرفات کا میدان اور اجتماع حشر کے میدان کا پورا اور صحیح نقشہ ہے وغیرہ۔ الغرض جس قدر سفر حج کو ایک انسان عقل وشعور اور فہم وتدبر کے ساتھ پورا کرے گا اسی قدر سفر آخرت میں بھی سہولت وآسانی ہوگی۔ کیونکہ دونوں سفروں کا اصل زادِراہ تقوی وپرہیزگاری اور خداپرستی وخداترسی کی زندگی ہے جو زندگی کا اصل مقصود ہے۔

۴۔ محبتِ خداوندی کا جلوہ عام:

انسان کا تعلق اللہ رب العزت کے ساتھ دو قسم کا ہے ایک بندگی اور غلامی کا کہ وہ ذات پاک مالک ہے، خالق ہے، احکم الحاکمین ہے اور یہ بندہ مملوک اور اس کی مخلوق ہے۔ اس تعلق کا مظہر نماز ہے جو سراسر بندگی وغلامی اور نیازمندی پر مشتمل ہے۔ اس تعلق کی پوری

تعمیل زکوٰۃ سے ہوتی ہے کہ مالک کا عطا کیا ہوا مال اس کے حکم سے اس کے نادار بندوں پر خرچ کیا جائے۔

دوسرا تعلق محبت کا ہے کہ جمال و کمال پر فریفتگی انسان کا فطری تقاضا ہے۔ اس تقاضے اور جذبے کو پورا کرنے کے لیے حج بیت اللہ مقرر کیا گیا۔

اعتراف غلامی اور ادائے بندگی کے لیے کسی چیز کو چھوڑنے کی حاجت نہ تھی۔ گھر سے نکلنے کے بغیر فریضۂ بندگی اور شیوہ غلامی ادا کیا۔ بارگاہ خداوندی میں حاضری دی اور بس، لیکن راہِ محبت میں سب کچھ چھوڑنا اور ہر شے کو خیر باد کہنا ہوگا کیونکہ یہ راہِ محبت کی اولین شرط ہے۔ بندگی سے آراستگی گھر کے گوشہ میں ہے تو پیار و محبت کی تکمیل کے لیے دشت وویرانہ درکار ہے۔ محبوب کی طلب و جستجو میں دیوانہ وار دیارِ محبوب کا رخ کرلیا اور جب دیارِ محبوب کے قریب پہنچا تو ہر نوع کی زیب و زینت، آرائش وزیبائش سے آزاد ہوگیا، نہ سر پر ٹوپی نہ بدن پر کُرتا اور نہ ٹانگوں میں پاجامہ کیوں کہ محب دیوانہ، لباس اور آرائش وزیبائش کی قید وبند سے آزاد ہو اور اپنی مجنونانہ ہئیت میں مست و سرشار رہتا ہے۔ یہی احرام باندھنے کی حقیقت ہے۔

چشم تر خاک بسر چاک گریباں دل زار
عشق کا ہم نے یہ دنیا میں نتیجہ دیکھا

غرض جب دیارِ محبوب کے قریب پراگندہ حال، دل بیتاب، حالت زار، چشم پُرنم، میلا کچیلا غبار آلود محبانہ صورت اور مجنونانہ ہئیت کے ساتھ پہنچے کہ محبت کا یہی دستور ہے اور یہی انسانیت کا اصلی کمال اور بندگی کا اعلیٰ مقام ہے۔ عاشقوں کا شیوہ اور دیوانوں کا دستور آہ و فغاں بھی ہوتا ہے اس سے دل بے قرار کو ایک گونہ تسکین ہو جاتی ہے اسی لیے حج کرنے والا مستانہ وار لبیک کہتا ہوا چیختا پکارتا دیوانوں کی طرح محبوب کی جستجو میں اس کی خصوصی تجلی گاہ کی جانب جاتا ہے۔ پھر جب محبوب کے گھر خانہ کعبہ پر نظر پڑتی ہے تو دل بے قابو ہو جاتا ہے، عقل مبہوت ہو جاتی ہے۔ کسی ننگ و نام آن شان کی پرواہ نہیں رہتی اور کسی ضابطہ و قانون کا پابند نہیں رہتا، بے اختیار محبوب کے گھر کا چکر کاٹتا ہے یہی طوافِ کعبہ ہے اور اس کے در و دیوار کو چومتا ہے اس کی چوکھٹ سے آنکھوں کو ملتا ہے اور اس پر اپنی پیشانی رگڑتا ہے۔ طواف کعبہ کی ابتداء

بھی حجر اسود کے بوسہ سے ہوتی ہے جس کو محبوب کے دست مبارک کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے تاکہ اس انتساب سے دل کی بھڑکی ہوئی آگ کو تسکین ہو۔ جس کی لذت وحلاوت کا احساس محبِ مہجور ہی کر سکتا ہے۔

خانہ کعبہ کی چوکھٹ وپردہ کو پکڑنا سر اور آنکھیں اس کو لگانا ربِ کعبہ کو بار بار پکارنا بھی اسی محبانہ ادا کی ایک جھلک ہے کہ محبوب کے دامن سے وابستگی بھی محبت کا نرالہ انداز ہے علیٰ ھذا القیاس۔

نفلی عبادات:

ان مذکورہ عبادات اور ارکان کے علاوہ بھی کچھ اہم و نفلی عبادات ہیں جن کے کرنے سے بندہ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب حاصل ہوتا ہے مثلاً ذکر اذکار، دعا، تلاوتِ قرآن اور نفلی نماز وروزہ وغیرہ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ۔ [بخاری]

"ہمیشہ ایک بندہ نفلی عبادات کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے حتی کہ میں اسے محبوب بنالیتا ہوں"۔

ذکر اذکار (یادِ الٰہی) ایک ایسی عبادت ہے جس کے لیے کوئی وقت وغیرہ خاص نہیں، بلکہ انسان ہر وقت وضو بے وضو، اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے ہر حالت میں کر سکتا ہے۔ جس سے دل کا زنگ دور ہوتا ہے، ذکر اذکار کے ساتھ اللہ سے استغفار طلب کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ وَاسْتَغْفِرُوْا فَاِنِّیْٓ اَتُوْبُ فِی الْیَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ [مسلم]

"اے لوگو! اللہ سے توبہ اور اپنے گناہوں کا استغفار کیا کرو کیوں کہ میں دن میں ۱۰۰ مرتبہ اپنے رب سے استغفار طلب کرتا ہوں"۔

ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوۃ وسلام بھیجنا۔ حدیث شریف میں ہے کہ

مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ وَاحِدَةً صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ عَشْرًا۔ [بخاری]

"جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس مرتبہ رحمت فرماتا ہے"۔

اس کے علاوہ اور مسنون اذکار کی پابندی کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی ایک عبادت ہے کیونکہ انسان اللہ کا محتاج ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ [مومن ۶۰]

"مجھے پکارو میں تمھاری دعا قبول کروں گا"۔

اس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرنے کا معمول بھی ہونا چاہیے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول تھا کہ کوئی قرآن پاک ایک مہینہ میں، کوئی ایک ہفتہ میں ختم کرتا تھا۔تلاوت کے ساتھ قرآن کریم اپنی زبان میں سمجھنا بھی نہایت ہی ضروری ہے تاکہ انسان کو یہ معلوم ہو کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں اور سیکھنے کے بعد اس پر عمل کرنا اور پھر اسے بیان کرنا بھی قرآن کا ایک بہت بڑا حق ہے۔

ضروری انتباہ:

ان تمام عبادات ، نماز، روزہ ،حج، زکوٰۃ، صدقہ وخیرات ،ذکر ودعا کے کرنے میں سنت کی پابندی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ادائیگی شرط ہے۔جو عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف اپنے طریقے اور رسم ورواج پر کیا جائے وہ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں۔جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ عَمِلَ عَمَلًا بِغَیْرِ سُنَّتِنَا [جامع صغیر]

"وہ ہم میں سے نہیں جس نے ہمارے سنت طریقے کے بغیر کوئی عمل کیا۔"

اس لیے اعمال میں سنت کے خلاف طریقوں سے بچنا چاہیے اور کوئی بھی عمل کرنے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سنت طریقے کو جاننا چاہیے اور پھر اُسی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔خود سے یا کسی مولوی یا پیر کے طریقے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔اعمال صالحہ کا دروازہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد بند ہو گیا تھا۔اس کے بعد جو کام بھی دین، اعمالِ صالحہ اور ثواب کے نام سے ہوگا، بدعت کہلائے گا اور بدعت سراسر گمراہی ہے۔

بہر حال خدمتِ دین اور احیائے دین کے سلسلے کا بنیادی کام یہ ہے کہ عقائد کے بعد ان ارکانِ اسلام میں نبوی روح اور حقیقت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اور امت کی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے ظاہر و باطن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت سے یکساں کرنے کی جدو جہد کی جائے۔

یہ تو عبادات کا مثبت پہلو تھا دوسرا منفی پہلو یعنی منہیات ہیں۔ وہ یہ کہ بعض مخصوص کام نہ کیے جائیں۔ یہ وہ کام ہیں جن کے بُرا ہونے اور ان کے روکنے پر دنیا کے تمام صاحبِ عقل لوگ متفق ہیں، مثلاً کسی جواز کے بغیر انسانی قتل، دوسروں کے حقوق پر دست درازی، ہر قسم کا ظلم، ہر نشہ جو عقل سلب کرلیتا ہے، زنا جو خاندانوں کی عزت و شرافت کا جنازہ نکال دیتا ہے اور نسب میں آمیزش کا سبب بنتا ہے۔ اسی طرح سود، جھوٹ، دھوکہ بازی اور کھوٹ ملانا، عہد شکنی، فوجی خدمت سے فرار، یہ سب ناجائز اور ممنوع کام ہیں۔ ان سے بھی بڑھ کر والدین کی نافرمانی، جھوٹی قسم اور جھوٹی گواہی وغیرہ ایسے جرائم ہیں جن سے اسلام سختی سے منع کرتا ہے اور ان کے علاوہ تمام بُرے کام جن کے بُرے اور ناروا ہونے پر عقولِ انسانی متفق ہیں۔

اگر کوئی مسلمان عملی اعتبار سے کوتاہی کرتا ہے، چند فرائض کی بجاآوری میں کوتاہی کرتا ہے یا کچھ ناجائز افعال کا ارتکاب کر گزرتا ہے، بعض فرائض ادا نہیں کرتا یا چند ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے جن سے منع کیا گیا ہے لیکن فرائض کے واجب العمل ہونے اور حرام کاموں کی حرمت کا اعتراف کرتا ہے تو وہ مسلمان رہے گا اگرچہ گنہگار ہوگا۔ اگر پھر نادم ہو کر توبہ کرلیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادے گا اور اگر توبہ نہیں کرتا اور اپنی غلط روش پر قائم ہے تب بھی اسے مسلمان شمار کیا جائے گا، لیکن وہ گناہ گار ہوگا اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہوگا۔ مگر یہ عذاب ایک مدت تک کے لیے ہوگا کافر کا سا ابدی عذاب نہ ہوگا۔

جہاد:

جہاد اسلام کا چھٹا رکن ہے حدیث شریف میں ہے کہ:

ذَرْوَةُ سَنَامِهِ اَلْجِهَادُ [مشکوٰۃ]

"اسلام کے کوہان کی بلندی (شان و قوت) جہاد ہے۔"

اسلام امن وشفقت کا دین ہے لیکن جب حقوق اللہ اور حقوق العباد پر ڈاکے پڑنے شروع ہو جائیں، انسان کو اس کے فطری حقوق سے محروم کرنا، غلام بنانا، اس کے مال وجان، عصمت خطرے میں پڑ جائیں، انسانیت پر ظلم اور اس کی تذلیل وتوہین شروع ہو جائے تو قدرتی طور پر جنگ کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام ایسی حالت میں ظالموں سے قطع تعلق کے ساتھ ساتھ امن وسلامتی کے قیام، مذہبی، معاشرتی وسماجی حقوق کی بحالی، فتنہ وفساد کی بیخ کنی اور ظلم وستم کے انسداد کے لیے بامر مجبوری طاقت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ کیونکہ

اَلْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ [بقرۃ:]

"فتنہ (فساد کفر وشرک) قتل سے بڑھ کر گناہ ہے"۔

اسی لیے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ [سورۃ البقرہ: ۱۹۳]

"ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ وفساد باقی نہ رہے"۔

اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۱۰ سالہ مدنی زندگی میں تقریباً ۷۵ غزوات میں شریک ہوئے۔ بنابریں جہاد مسلمانوں پر فرض ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ [بقرہ:]

"اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو"

حدیث میں آیا ہے کہ:

اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

"جہاد قیامت تک جاری رہے گا"۔

آج اسلام ، جہاد اور مسلمان مجاہدین کے خلاف بہت زہریلا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ اسلام اور جہاد دہشت گردی ہے، اور جہاد کرنے والے مجاہدین دہشت گرد اور انتہا پسند ہیں، حالانکہ ایسا ہر گز نہیں۔ جہاد دہشت گردی ہے نہ انتہا پسندی، بلکہ جہاد سے دہشت گردی اور ظلم و بربریت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ مجاہدین دہشت گرد ہیں نہ دقیانوس اور نہ فسادی، بلکہ عالم دنیا میں امن کے متوالے ہیں ۔ یہ مجاہدین دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر گزارنے والے اور راتیں مصلے پر ، دن کی روشنی میں کفار کو للکارنے والے اور رات کی خاموشی میں اپنے رب کے سامنے آنسو بہانے والے ، ان کی زبانوں پر تلاوت ہوتی ہے اور ہاتھوں میں آتشین ہتھیار، آنکھوں میں حیا اور جبینوں پر ایمان کی چمک ، دلوں میں جذبات کا تلاطم اور دماغوں میں عالم اسلام کے ماتھے سے ذلت اور بزدلی کا داغ دھونے کا عزم۔ مجاہدین حادثاتی طور پر ایسے ہی پیدا نہیں ہوتے، بلکہ ان کی تلاش میں فلک برسوں پھرتا ہے اور نرگس ہزاروں سال روتی ہے ، لیکن ناقدروں نے انہیں ایسے ہی گنوادیا۔ وہ عفت و عصمت اور عظمت و ایثار کے چلتے پھرتے شاہکار ہیں۔ ان کے کوئی ذاتی مفادات نہیں ہوتے ۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے زندہ ہیں اور انکا اور کیا مفاد ہوگا؟ اپنی راحت اور خوشی کی زندگی، مال و دولت ، بیوی بچے ملک و متاع چھوڑ کر پہاڑوں، چٹانوں اور مشکلات کی زندگی اپنا کر اپنے عزیز و اقرباء ، اپنے دوستوں اور ہم وطنوں سے ہزاروں میل دور جاکر انھوں نے کونسے مفادات حاصل کرنے ہیں؟ دہشت گرد تو وہ خوفناک دیو اور کفر کے غلیظ مگرمچھ ہیں، جنھوں نے اپنے جبڑوں میں افغانستان سے چیچنیا تک اور کشمیر سے فلسطین و عراق تک کے مظلوم مسلمانوں کو فقر و فاقہ کی حالت میں جکڑ رکھا ہے، جنھوں نے مسلمانوں کو کیوبا اور عراق کے (گوانتاناموبے اور ابوغریب) جیلوں میں بدترین حیوانیت جیسا سلوک روا رکھا ہے، دہشت گرد تو وہ ہیں، جنھوں نے اپنے ظلم سے تاتاریوں کو شرمندہ کردیا ہے۔ دہشت گرتو وہ ہیں، جو سمندر پار سے آکر مسلمانوں کے ممالک ، املاک ، تیل معدنیات وغیرہ پر غاصبانہ قبضہ کیے ہوئے ہیں، جنھوں نے بے کس ، مظلوم ، بے گناہ عوام پر کروز میزائل ، ڈیزی کٹر اور کلسٹر بم پھینکے ، ہزاروں عورتوں کو بیوہ کیا، بچوں کو یتیم بنایا ، بوڑھوں پر ظلم و تشدد کیا ۔ مظلوم مجاہدین نے کیا دہشت گردی کی تھی۔۔؟ دنیائے کفر

یہود و نصاریٰ کا آخر کیا بگاڑا تھا۔۔؟ انھیں اپنی دہشت گردی تو کبھی نظر نہیں آتی، لیکن جب کوئی مجاہد مسلمان اپنے ملک و وطن اور دینِ اسلام کے دفاع کی بات کرتا ہے، ظلم اور اس فرعونیت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، ان بیواؤں، یتیموں اور بے کسوں کا سہارا بنتا ہے، اپنی ملکیت اور اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ دہشت گرد کہلاتا ہے۔ اگر دنیائے کفر کے اداریں اپنے خود ساختہ قوانین بنانے، حیوانیت سے مامور اپنی بدترین تہذیب میں اُس نام نہاد تہذیب میں جس میں مادر پدر آزادی ہے، جس میں زناکاری، شراب خوری اور لواطت جیسے گھٹیا حرکات قانوناً جائز ہیں، اور تو اور ان کی اخلاقی بدحالی تو یہاں تک پہنچ گئی کہ عورت اور مرد دونوں اپنی جنسی خواہشات پورا کرنے کے لیے اپنے ہم جنس سے علی الاعلان نکاح کر سکتے ہیں۔ جس معاشرہ میں اپنے والدین کو بڑھاپے میں چھوڑ کر اولاد ان کی خدمت کے لیے تیار نہیں، اس طرح کی بربریت اور حیوانیت بھرے قوانین نافذ کرنے میں وہ آزاد ہیں، یہ ان کا حق سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی یہ لوگ " مہذب " کہلاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ اگر اپنے خالق و مالک کا بہترین امن و امان پر مبنی اور انصاف کا ضامن قانون شریعت نافذ کرنے کا نام لیتا ہے تو وہ دہشت گرد اور فسادی ہے؟ پھر چلو کفار تو دشمن رہیں ہی، لیکن افسوس اُن لوگوں پر ہے جو خود کو مسلمان کہلاتے ہیں اِن کے منہ میں بھی کفار کی زبان بولتی ہے۔

دعوت و تبلیغ:

اگر جہاد اسلام کا کوہان اور شان و شوکت اور قوت ہے تو دعوت و تبلیغ اسلام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ دعوت کے بغیر دین کی اشاعت ناممکن ہے۔ اس لیے قرآن و سنت میں دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ دعوت تمام انبیاء علیہم السلام کا متفق علیہ کام ہے۔ اب نبوت تو ختم ہو گئی مگر کارِ نبوت باقی ہے اور قیامت تک کے لئے جاری رہے گا۔ اب انبیاء علیہم السلام کے بعد یہ ذمہ داری اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر عائد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

[آل عمران: ۱۱۰]

"تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو"۔

کیونکہ آنبیائے کرام علیہم السلام کے ذمے دو کام تھے۔ایک وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے اس طرز زندگی اور ہدایت کا علم حاصل کرنا اور دوسرا اس علم وہدایت کو دوسروں تک پہنچانا، بتانا، سکھانا اور ان کو اس پر چلانے کی کوشش کرنا۔ان میں سے پہلا کام تو سلسلۂ نبوت ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ ختم نبوت کا مطلب ہی یہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی اور کو یہ مقام ومنصب عطا نہیں فرمایا جائے گا کہ وحی کے ذریعے اس پر دین وشریعت کے احکام نازل ہوں اور اس کو نبی مان کر اس کی اطاعت اور تابعداری کرنا لوگوں کے لئے ضروری ہو۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی اس ہدایت وشریعت، جو قیامت تک پیدا ہونے والے سب انسانوں کی رہنمائی کے لئے کافی ہے اور جس کے آخری زمانے تک محفوظ رہنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انتظام بھی کر دیا گیا ہے، نے اس ضرورت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا، لیکن سلسلۂ نبوت کا دوسرا کام یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی اس ہدایت کو بندوں تک پہنچانا اور ان کو اس پر چلانے کی کوشش کرنا باقی اور جاری ہے اور امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خاص شرف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں وہ اس مقدس مشن کو قیامت تک جاری رکھنے اور اس کار نبوت کو انجام دینے کی ذمہ دار ہے۔

بنابریں امر بالمعروف ونہی عن المنکر دین کا اہم رکن ہے جس سے دین کی تمام چیزیں وابستہ ہیں۔ امر بالمعروف ایک عالمگیر شعبہ ہے اور امتِ محمدیہ کو خاص طور پر اس پر مامور کیا گیا ہے۔ امتِ محمدیہ کی فضیلت اور برتری کی وجہ تلاش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ اور برتر کام اس کے سپرد کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اسے خیر الامم کا معزز خطاب عطا کیا گیا ہے۔

یہ خدمتِ خلق کا جذبہ بھی ہے، انسانیت کو دوزخ سے بچانے کا عظیم فریضہ بھی ہے۔ در حقیقت پیدائش کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت ہے اور یہ اس وقت تک نا ممکن ہے جب تک بنی نوع انسان کو برائیوں اور گندگیوں سے پاک کرکے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جائے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ فلاح و بہبود انہی لوگوں کے لیے ہے جو اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

اب دین کی اشاعت کی ذمہ داری و باگ دوڑ اس اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔ اس کے کرنے میں تو کامیابی ہی کامیابی ہے، جبکہ نہ کرنے میں دو نقصان ہیں۔

۱۔ پہلا نقصان خود کو نااہل قرار دینا اور اپنے سر پر ایک بہت بڑا الزام لے لینا ہے، کیونکہ اللہ نے انسان کو جس کام کے لیے پیدا کیا ہے وہ اگر اس کو انجام نہ دے اور اس کے علاوہ دیگر ہزاروں کام کرلے تو وہ سب بے کار ہی ہیں۔

۲۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ انسانیت سسک رہی ہے جبکہ باقی سب کام ہو رہے ہیں۔ صرف دعوت و بیان حق اور ردِ منکرات کا کام نہیں ہو رہا کیونکہ یہ محاذ جن سپاہیوں کو سونپ دیا گیا تھا وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں اس لیے خود بھی اس مذہب اور اس سے ملنے والے فائدوں اور نعمتوں سے محروم ہو گئے۔

اس اہمیت کی بناء پر ہر مسلمان کا داعی بننا ضروری ہے۔ چونکہ دعوت کو صورتِ حال کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور صورتِ حال ہمیشہ بدلتی رہتی ہے اس لیے دعوت کے کام میں داعی کے لیے حاضر کلامی اور حاضر دماغی دونوں کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ دعوت پیش کرنے والوں کو انسانی نفسیات سے گہری واقفیت اور اس کی دکھتی رگوں اور سوسائٹی کے کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھ کر بتانا ہوتا ہے کہ انکا حال قران وسنت کی روشنی میں کیا ہے ؟اس لئے ضروری ہے کہ داعی معاشرے پر کڑی نظر رکھے جہاں خرابی اور منکر نظر آئے اس کا سدباب کرکے صحیح راستہ دکھائے اور ساتھ ساتھ داعی کے لئے ان اُصولوں کا سمجھنا اور مدِ نظر رکھ کر دعوت و تبلیغ کرنی ہوگی جو قرآن وسنت نے اس کے لیے وضع کیے ہیں۔

اسلامی نظامِ اخلاق

Islamic Mannerism system.

اسلام میں عقائد و عبادات کے بعد اخلاق پر بہت زور دیا گیا ہے۔اخلاق اسلامی نظریئے کے تحت کسی الگ چیز کا نام نہیں، بلکہ وہ دین ہی کا اہم حصہ ہے۔انسان کے اندر اخلاقی حسن ایک فطری حسن ہے جو بعض صفات کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا۔ سچائی، انصاف ،پاس داری، امانت، ہمدردی، رحم ،فیاضی ،فراخ دلی،صبر و تحمل، استقلال وبردباری، اُولوالعزمی وشجاعت،ضبطِ نفس، خودداری، شائستگی وملنساری،فرض شناسی، وفاداری، کفایت شعاری، مستعدی، احساسِ ذمہ داری، نظم وضبط،تعاون، امداد باہمی، پاکدامنی، خوشگفتاری، نرم مزاجی، وخیر اندیشی، راست بازی و کھرا پن، معاملات میں اعتبار اور صفائی، ظاہر و باطن و قول و فعل میں مطابقت ،والدین کی خدمت ،رشتہ داروں کی امداد، ہمسائیوں سے حسنِ سلوک ،دوستوں سے رفاقت، یتیموں کی خبر گیری، مریضوں کی تیمار داری اور مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت وغیرہ اس قسم کے اوصاف ہمیشہ انسانی اخلاقیات میں تعریف کے مستحق سمجھے گئے ہیں۔

اسلام میں اللہ کے مبعوث کردہ انبیائے کرام علیہم السلام نے نیکی بدی کا تصور پیش کر کے ان اچھے اوصاف کو اپنانے اور انسانوں کو یہ اوصافِ حسنہ عمل میں لانے کی دعوت دی ہے اور ان کے مقابل ان برے اوصاف سے نفرت دلا کر ان سے بچنے کی تاکید کی ہے جن کو فطرتِ انسانی ہمیشہ اجتماعی زندگی کے محاسن میں شمار نہیں کرتی۔ جیسے جھوٹ ، ظلم، بدعہدی، خیانت،خود غرضی، سنگدلی، بخل وتنگ نظری، بے صبری، کاہلی ، کم حوصلگی و بزدلی، بندگیِ نفس، کم ظرفی ،بد تمیزی،بد خلقی، بد نظمی انتشار و تفرقہ ،بے ضابطگی، نا اتفاقی ،آپس کی بد خواہی، ظلم و ناہمواری،چوری ،زنا، قتل،ڈاکہ، جعلسازی اور شوت خوری،بد زبانی ،مردم

آزاری، غیبت، چغل خوری، حسد، بہتان تراشی و فساد انگیزی، مکر، تکبر، ریاکاری، منافقت، ہٹ دھرمی و ضد اور حرص وغیرہ۔

اخلاق حسنہ اور سیئہ کے مبادی:

الغرض جو افعال خیر کے مبادی اخلاقِ حسنہ اور افعال شر کے مبادی اخلاقِ سیئہ ہیں۔

اخلاقِ حسنہ کا منشا چند امور ہیں:

(۱) فطرت کی پاکیزگی (۲) عادت کی خوبی

(۳) عقل کی راستی (۴) ایمان باللہ (۵) توحید باری تعالیٰ۔

یہی وہ اسباب ہیں جن سے اخلاقِ حسنہ کا ظہور ہوتا ہے اور اخلاقِ حسنہ کے جس قدر اضداد ہیں وہ سب کے سب اخلاقِ سیئہ ہیں۔ اخلاقِ سیئہ کا منشا بھی چند امور ہیں:

(۱) طینت کی خباثت (۲) جبلت کا فساد

(۳) سوء عادت اور (۴) بُری صحبت۔

یہ وہ اسباب ہیں جن سے اخلاقِ رذیلہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان بُرے اخلاق کے بُرے اثرات اس زندگی پر بھی پڑتے ہیں اور اخروی زندگی بھی خراب ہوتی ہے۔ شیخ القرآن مولانا محمد طاہر رحمہ اللہ سورۃ اعراف آیت نمبر (۳۳) کے تحت فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت میں اللہ نے استکمالِ نفس اور تہذیبِ اخلاق کے لیے چار بنیادی صفات کا تذکرہ کیا ہے جو تمام اخلاق کی بنیاد ہیں اور ان کے اپنانے سے آدمی کامل انسان بن جاتا ہے۔

۱۔ عفت: جس کی طرف حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ میں اشارہ ہے۔

۲۔ حلم: جس کی طرف وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ میں اشارہ ہے۔

۳۔ شجاعت: جس کی طرف وَأَنْ تُشْرِکُوا بِاللّٰہِ میں اشارہ ہے۔

۴۔ علم: جس کی طرف مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں اشارہ ہے۔

تہذیبِ اخلاق کا طریقہ:

اللہ تعالیٰ نے انسان میں مختلف قوتیں رکھی ہیں اور ہر ایک کا میدانِ عمل اور طبعی رجحان جدا ہے۔ علمِ اخلاق کے علماء نے ان میں سے تین کو اصل قرار دیا ہے باقی قوتوں کا

اعتدال انہی پر موقوف ہے۔ قوتِ شہوانیہ، و قوتِ غضبیہ، قوتِ ملکیہ، ان میں پہلی دو قوتوں کا تعلق انسانی خواہشات اور جذبات سے ہے۔ جس قدر ان میں افزودگی ہو گی خواہشات و جذبات میں افزودگی ہو گی۔ صرف آخری قوت (ملکیہ) کا تعلق روحانی نشوونما سے ہے۔ پہلی دونوں قوتیں ہمیشہ بدی اور برائی کی طرف کھینچتی ہیں اور تیسری قوت کی کشش نیکی کی جانب ہوتی ہے۔ جب تک پہلی دو قوتیں کمال پر رہتی ہیں اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ انسان معصیت اور برائی سے بچے اور اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہو کیونکہ اس کی قوتِ ملکیہ مضمحل اور کمزور ہے اور جب قوتِ ملکیہ میں کمال پیدا ہو جاتا ہے اور اس حد تک قوت حاصل کر لیتی ہے کہ وہ پہلی دونوں قوتوں کو مغلوب کر سکے تو پہلی دونوں قوتیں مضمحل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور معصیت اور برائی کی ان میں ہمت وطاقت نہیں رہتی۔ قوتِ ملکیہ ان کو نیکی کی جانب مائل کر دیتی ہے اور نفس کو اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کر دیتی ہے۔

پس تہذیبِ اخلاق کا طریقہ صرف یہ ہے کہ قوتِ ملکیہ کو عروج و کمال پر پہنچایا جائے تا کہ وہ غالب ہو کر پہلی دونوں قوتوں کو مغلوب اور مقہور کر کے ان پر حکمرانی کر سکے اور قوتِ ملکیہ کو عروج و کمال صرف روحانیات اور ایمانیات سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک نفس روحانی لذات سے آشنا نہیں ہوتا مادی لذات کو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا۔

اسلام میں اخلاق کی اہمیت:

اخلاقِ حسنہ کی دعوت و تعلیم اسلام کا خاص الخاص موضوع ہے۔ قرآن و حدیث میں اخلاق کا ایک ایسا مکمل، جامع اور انسانی فطرت کے اس قدر مطابق معتدل نظام ہے کہ اگر انسان اس پر عامل ہو جائے تو وہ اس زمین پر انسانی صورت میں دوسروں کے لیے رحمت ثابت ہو گا اور اس کا مکمل نمونہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مشہور ارشاد ہے کہ:

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ [مسند امام احمد بن حنبل]

"یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وہی ہیں جو قرآن کی تعلیم ہے"۔

قرآن کریم نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ [سورۃ القلم: ۴]

"بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہترین اخلاق والے ہیں"۔

اس لیے مسلمانوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو اپنے لئے نمونہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [احزاب: ۲۱]

"بے شک تمہارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے"۔

اسلام میں حسنِ اخلاق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ:

إِنَّمَا بُعِثْتُ لأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الأَخْلاقِ [سند البزار]

"مجھے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے"۔

اسی طرح فرمایا کہ:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ [ابو داؤد، ترمذی]

"قیامت کے دن مومن کے ترازو میں حسنِ خلق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہیں ہوگی"۔

اسلام کا نظامِ معاملات و معاشیات

Islamic economics system

۱۔ اسلام ایک ہمہ گیر دین ہے جس میں زندگی کی تمام ضروریات پوری کرنے کیلئے اصول و قواعد موجود ہیں اور یہ یقیناً زندگی کے تمام پہلوؤں کا کما حقہ احاطہ کرتا ہے۔یہی وجہ ہے اسی بناء پر اسلام میں معاملات و معاشیات کا ایک معتدل، جامع اور انسانیت کے دنیوی واخروی فوائد پر مشتمل ایک نظام موجود ہے۔

۲۔ اسلام رہبانیت یعنی ترکِ دنیا کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز بلکہ بعض اوقات ضروری قرار دیتا ہے اور کسبِ حلال اسکی نظر میں فریضۃ بعد الفریضۃ کی حیثیت رکھتا ہے جیسے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ:

طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ [مشکوٰۃ]

"حلال کمائی کو تلاش کرنا فرض کے بعد ایک فرض ہے"۔

لیکن دوسری طرف دنیوی زندگی کیلئے متاع الغرور کے الفاظ بھی اسلام میں نظر آتے ہیں۔ان سب چیزوں کے لئے "الدنیا" کا لفظ ملتا ہے جو اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا جس سے اس کی حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

۳۔ اسلامی نظامِ معاشیات پر بحث کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام و قرآن کی نظر میں معاشی مسئلے کو ایک مرتبہ ومقام تو یقیناً حاصل ہے لیکن اس کی نظر میں معاش اور اسکی ترقی انسان کا بنیادی مسئلہ اور مقصدِ زندگی نہیں جیسا کہ دنیا کے دوسرے نظاموں سوشلزم، کمیونزم اور کیپٹل ازم میں سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ تو ایک ضرورت اور راہ گزر ہے۔

۴۔ ان سب باتوں کی حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں دنیا، اس کے وسائلِ معاش انسان کی ضرورت اور راہ گزر کے مراحل ہیں جیسا ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: «أَخَذَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْكِبِي فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ۔ [بخاری]

"تم دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم اجنبی مسافر ہو، بلکہ راستہ چلنے والے کی طرح دنیا میں رہو۔"

اسی طرح ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ وہ رزق کے حصول میں بہت متحرک ہے اور پوری دلچسپی لے رہا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس کی یہ دوڑ دھوپ اور دلچسپی اللہ کی راہ میں ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلٰى وَلَدِهٖ صِغَاراً فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللهِ وَاِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى عَلٰى نَفْسِهٖ يُعِفُّهَا فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللهِ اِنْ كَانَ خَرَجَ يَسْعَى رِيَاءً وَمُفَاخَرَةً فَهُوَ فِي سَبِيْلِ الشَّيْطٰنِ [ترغیب بحوالہ طبرانی]

"اگر وہ اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو یہ اللہ کی راہ ہی میں شمار ہو گی اور اگر بوڑھے والدین کی پرورش کے لیے کوشش کر رہا ہے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہی شمار ہو گی اور اگر اپنی ذات کے لیے کوشش کر رہا ہے اور مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچا رہے تو یہ کوشش بھی فی سبیل اللہ شمار ہو گی۔ البتہ اگر اس کی یہ محنت زیادہ مال حاصل کر کے لوگوں پر برتری جتانے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے ہے تو یہ ساری محنت شیطان کی راہ میں شمار ہو گی"۔

بہر حال انسان کی زندگی کا مقصد کردار کی بلندی اور خیر کی تحصیل ہے۔ لیکن ان دونوں منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں جو اسکی دنیوی زندگی کیلئے ضروری ہیں۔ لہٰذا جب تک وسائلِ معاش انسان کے اصلی مقصد و منزل کے لئے راہگزر کا کام دیں تو وہ فضل اللہ، خیر اور زینۃ اللہ ہیں، لیکن جہاں انسان اسی راہ گزر میں اُلجھ کر اسے اپنی منزلِ مقصود کے راستے میں

رکاوٹ بنالے ،یعنی آخرت کو بھول کر صرف حصولِ دنیا کا طالب بن جائے تو پھر یہی معاش ،دولتِ دنیا، متاع الغرور، فتنہ اور دشمن بن جاتا ہے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو ایک مختصر جملہ میں بیان فرمایا ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا اٰتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ۔ [قصص:۷۷]

"تجھ کو اللہ نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالمِ آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی احسان کیا کر"۔

اسلامی نظامِ معاش:

اسلام ایک متوازن معیشت کا حامی ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو۔ نہ تو یہ افراد کو اپنی محنت سے اکٹھی کی ہوئی ملکیت سے محروم کر دینے کی اجازت دیتا ہے جیسے کمیونزم کہ وہ محنت کے باوجود مشکل و تنگدستی میں زندگی گزارے ،نہ سوشلزم کے نظریے کے مطابق بغیر محنت کے عیش و عشرت میں لگے رہنے کی اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح دولت پر سانپ کی طرح جمے بیٹھے رہنے کی ،بلکہ اسلام ان انتہاؤں کو ختم کرکے اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔اسلامی نقطۂ نظر سے زمین ،اسکی پیداوار اور سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے فائدے کیلئے پیدا کی ہیں۔اس سے فائدہ اٹھانا اور رزق حاصل کرنا تمام انسانوں کا برابر پیدائشی حق ہے۔ کسی پر پابندی لگانے کی اجازت نہیں کہ فلاں رزق کے وسائل کو استعمال کرنے کا حقدار نہیں یا کوئی مخصوص طبقہ ،نسل اس کی اجارہ دار بن کر دوسروں کو محروم کردے۔اسلامی نظریے کے مطابق معیشت کے میدان میں ہر وہ شخص جو اپنی محنت واستعداد کے مطابق براہ راست ابتداءً قدرت کے وسائل کے خزانے میں سے کوئی چیز لے اور اپنی محنت اور قابلیت سے اسکو کارآمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے کوئی دوسرا اِس پر قبضہ نہیں کرسکتا۔ اسلام کی نظر میں جائز شرعی مالکانہ حقوق بہر حال احترام کے لائق ہیں اور جو ملکیتیں ازروئے شرع جائز نہ ہوں انہیں بے شک ختم ہو جانا چاہیے۔اگر ملکیت شرعاً صحیح ہوں تو کوئی حکومت و

مجلسِ قانون ساز اجتماعی بہتری کا نام لے کر انہیں سلب نہیں کر سکتی۔ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق دولت خواہ کسی بھی شکل میں ہو وہ اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اِسی کی ملکیت ہے۔انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کی عطاء سے ہی ہوتا ہے۔یعنی اللہ کی ملکیت اصلاً اور انسان کی ملکیت تبعاً ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے:

وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللهِ الَّذِی آتَاكُمْ۔ [نور: ۳۳]

"اللہ کے اس مال میں سے ان کو بھی دو جو اللہ نے تم کو دے رکھا ہے"۔

جب دولت پر اصل ملکیت اللہ کی ہے اور اس نے انسان کو اسمیں تصرف کا حق عطاء کیا ہے تو اس لیے اللہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور اپنے مصالح کا پابند بنائے چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر ملکیت تو حاصل ہے مگر یہ ملکیت آزاد، خود مختار اور بے لگام نہیں بلکہ اس دولت پر اصلی مالک (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے کچھ حدود و قیود، قوانین اور پابندیاں عائد ہیں۔جس جگہ وہ خرچ کرنے کا حکم دے دے وہاں خرچ کرنا اور جہاں خرچ کرنے کی ممانعت کر دے وہاں رُک جانا لازمی ہے۔جن ذرائع سے دولت حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کی جانب سے صحیح قرار دی گئی ہے ان سے حاصل کرنا اور جن کے ذریعے حاصل کرنا منع فرمایا گیا ہے ان کو چھوڑنا ضروری ہے جیسے حرام، دھوکہ، ملاوٹ، سود اور رشوت وغیرہ۔

اسلام میں معاملات کی شرائط:

اس لیے اسلام میں معاملات کے لیے مندرجہ ذیل شرائط مقرر ہیں۔

ا۔تراضی:

یعنی فریقین کی رضا مندی، مثلاً دوکاندار اور خریدار دونوں آپس میں اس معاملے پر راضی ہوں، اسی طرح مزدور و مالک میں جو بھی معاملہ طے پائے تو دونوں کی رضامندی بہر حال ضروری ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی راضی نہ ہو تو اسلام اس معاملے کو ناجائز قرار دیتا ہے لیکن اس رضامندی سے شرعی رضامندی مراد ہے۔

۲۔ معاملہ باطل نہ ہو:

یعنی معاملہ میں کوئی حرام چیز نہ ہو مثلاً کوئی ایسی تجارت یا زراعت کا معاملہ جس میں سود کی آمیزش یا دھوکہ ہو یا جھوٹ یا مبیعہ (بیچی جانے والی چیز) یا ثمن (قیمت) میں کوئی ایک حرام ہو تو اسلام ایسے معاملات کو بھی حرام اور باطل قرار دیتا ہے۔

۳۔ معاملہ فاسد بھی نہ ہو:

یعنی فریقین آپس میں راضی ہوں اور معاملہ بھی باطل نہ ہو لیکن بعض خارجی اسباب کی بناء پر وہ معاملہ شرعاً صحیح نہ ہو جیسے بیع کے ارکان یعنی ایجاب و قبول میں کوئی نقص ہو مثلاً خرید وفروخت میں ثمن یا مبیعہ مجہول، نامعلوم ہو وغیرہ یا پھل آنے سے پہلے باغ فروخت کیا جائے وغیرہ بیع فاسد میں اگر خریدار نے سودا پر قبضہ کر لیا ہو تو بیع نافذ تو ہو جائے گی مگر سودی معاملے کے حکم میں ہوگا۔

اسلامی نظامِ معاش کے اصول:

اسلامی نظامِ معاش کے تین بنیادی اصول ہیں:

۱۔ کفالتِ عامہ ۲۔ محنت کی قدر

۳۔ بے جا استحصال یعنی ارتکازِ دولت کی بیخ کنی۔

۱۔ کفالتِ عامہ:

اسکا مطلب یہ ہے کہ دولت کی اصلاً ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور وہی اسکے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے۔ اس لیے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے، بلکہ ہر وہ شخص بھی مستحق ہے جس تک پہنچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا معاشرے میں فقراء، مساکین، نادار اور بے کس افراد بھی اسکے حقدار ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [معارج: ۲۵، ۲۴]

"اور جن کے مالوں میں حصہ مقرر ہے مانگنے والے اور ہارے ہوئے کا"

یعنی زکوۃ، عشر، کفارات، صدقہ فطر، نفقات، وراثت، خراج وجزیہ وغیرہ سے انکی مدد کی جائے۔

۲۔ محنت کی قدر:

اسلامی معشیت کی دوسری خصوصیت محنت کی قدردانی ہے۔اسلام محنت و مشقت، کسبِ معاش اور رزقِ حلال کی تلاش کی ترغیب دیتا ہے۔اور ایک ایسا نظام نافذ کرنا چاہتا ہے جس میں انسان جبر و تشدد کی بجائے قدرتی طور پر اپنی استعداد اور اپنے اختیار و پسند کے مطابق خدمات انجام دے تاکہ اسکی خدمات زیادہ موثر، مفید و صحت مند ہوں اور مستاجر یعنی آجر اور اجیر (مالک و مزدور) کے درمیان صحیح رشتہ قائم اور ایک دوسرے کے حقوق یقینی طور پر محفوظ ہوں۔

۳۔ بے جا استحصال یعنی ارتکازِ دولت کی بیخ کنی:

تقسیمِ دولت کا تیسرا اُصول جس کی اسلام میں بہت اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند لوگوں یا چند ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے اور اسطرح امیر و غریب کا تفاوت جس حد تک قابلِ عمل ہو کم کیا جائے اور دولت کے جو اولین ماخذ ہیں یعنی کانیں، جنگل، غیر مملوک بنجر زمین، پانی، شکار، خودرو گھاس، دریا و سمندر، مالِ غنیمت وغیرہ پر کسی فرد یا جماعت کا پہرہ نہ بیٹھے بلکہ معاشرے کا ہر فرد اِن سے استفادے کا مساوی حقدار ہے اور اسکو اختیار ہے کہ وہ اپنے کسب و عمل کے مطابق فائدہ اٹھائے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ [حشر: ۷]

"تاکہ وہ (مالِ فئی) تمہارے مالداروں کے قبضہ میں نہ آجائے"۔

اور جو شخص اپنے کسب و عمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو اس کے کسب و عمل کا احترام کرکے اس کی ملکیت تسلیم کی گئی ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ [زخرف: ۳۲]

"اور دنیوی زندگی میں ان کی روزی ہم نے تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر درجات میں فوقیت دے رکھی ہے"۔

تقسیمِ دولت کے ان مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے اور تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے، اور دوسرا مقصد دونوں نظاموں سے۔

دولت کے مستحقین:

اسلامی نظام میں تقسیمِ دولت کے پیشِ نظر دولت کے مستحق افراد دو قسم کے ہیں۔ ایک اولین مستحق ہیں یعنی وہ لوگ جو کسی عملِ پیدائش کے بعد بلا واسطہ کے مستحق ہوتے ہیں، یہ مستحق افراد عواملِ پیداوار ہیں، جنھوں نے کسی پیداوار کے عملِ پیدائش میں حصہ لیا۔ دوسرے ثانوی مستحق افراد ہیں یعنی وہ لوگ جو براہِ راست عملِ پیدائش میں شریک تو نہیں ہوئے لیکن عاملینِ پیدائش کے ذمے یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں مثلاً غرباء و مساکین وغیرہ۔

جیسا کہ بتایا گیا کہ دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں لیکن عوامل پیداوار کا تعین، انکی اصطلاحات اور ان پر تقسیمِ دولت کے طریقے اسلام میں وہ نہیں جو سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظامِ معیشت میں مقرر کیے گئے ہیں۔ اسلام میں پیدائش کے حقیقی عوامل تین ہیں: (۱) سرمایہ (۲) زمین (۳) محنت

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اولاً ان تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بہ شکلِ منافع (نہ کہ بہ شکلِ سود) ملے گا، دوسرا حصہ زمین کو بہ شکلِ کرایہ، اور تیسرا حصہ محنت کو بہ شکلِ اُجرت ملے گا (جس میں جسمانی محنت اور تنظیم و منصوبہ بندی کی ذہنی اور فطری محنت سب داخل ہیں)۔ جبکہ سرمایہ دارانہ نظام میں ان تینوں کے علاوہ چوتھا عامل آجر یا تنظیم ہے۔ جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انہیں کام میں لگاتا اور نفع و نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔ (جیسے آجکل سودی بینک وغیرہ) سرمایہ دارانہ نظام میں ان چار عاملین پیداوار کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے اس کو انہی چاروں پر

کچھ اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ سرمایہ کو سود کی شکل میں ،دوسرا حصہ محنت کو اجرت کی شکل میں ، تیسرا حصہ زمین کو لگان یا کرایہ کی صورت میں اور چوتھا حصہ آجر، تنظیم، بینک، کمپنی کو منافع کی صورت میں دیا جاتا ہے ۔اس کے برعکس اشتراکی نظامِ معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کے بجائے قومی ملکیت ہوتی ہے ،آجر بھی اشتراکی نظام میں کوئی فردِواحد ہونے کی بجائے خود حکومت ہوتی ہے۔ اس لیے لگان،اور منافع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب صرف محنت رہ جاتی ہے اوراشتراکی نظام میں دولت کی وہی مستحق ہے جو اسے اُجرت کی شکل میں ملتی ہے۔

سرمایہ لگانے کی صورتیں:

اسلام میں سرمایئے کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) انفرادی کاروبار (۲) شرکت (۳) مضاربت۔

چوتھی صورت سودی کاروبار ہے جس کو شریعت نے ناجائز اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ جنگ کے مترادف قرار دیا ہے۔اسطرح شراب ، نشہ آور چیزوں ، فحش کاری ، رقص و سرور ،جوا،سٹہ، لاٹری، رشوت، حرام، کسی غیرے کا حق وغیرہ سے حاصل شدہ سرمایہ بھی منع اور حرام قرار دیا ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ پاک وحلال کھانے کا حکم دیتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا۔ [بقرۃ:۱۶۸]

"اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ [بقرۃ:۱۸۸]

"اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کرکے اور تم کو معلوم ہے"۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا، ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلُ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ، وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ [مسلم]

"اللہ تعالیٰ خود پاک ہیں اور پاک مال ہی کو قبول کرتا ہے پھر ایک شخص کا ذکر کیا جو دور دراز کا سفر کرتا ہے اس حال میں کہ اس کے سر کے بال پراگندہ ہوں اور سر سے پاؤں تک غبار آلود ہو اور آسمان کیطرف دونوں ہاتھ اٹھا کر خوب الحاح کے ساتھ دعا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب لیکن اس کا کھانا پینا حرام مال سے ہوا اور حرام مال ہی سے اس کی پرورش ہوئی ہو تو اس حالت میں اس کی دعا کیونکر قبول ہوگی"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

مَنِ اشْتَرَىٰ ثَوْبًا بِعَشَرَةِ دَرَاهِمَ وَفِيهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللهُ تَعَالَىٰ لَهُ صَلٰوةً مَادَامَ عَلَيْهِ [مشکوٰۃ]

"جس نے دس درہم کا ایک کپڑا خریدا اور ان دس درہم میں سے ایک درہم حرام ہو تو جب تک وہ شخص اس کپڑے کو استعمال کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی کوئی نماز قبول نہیں کریگا"

یہ تو تقسیمِ دولت کے اولین حقداروں کے متعلق بات تھی۔ اب تقسیمِ دولت کے ثانوی مستحقین کے بارے میں مختصر بات یہ ہے کہ معاشرے کے کمزور عناصر کو قوی کرنے اور بیکار افراد کو قابلِ کار بنانے کے لیے ایک باقاعدہ نظام مقرر ہے جن سے مندرجہ ذیل مدات، زکوۃ، عشر، کفارات، صدقۃ الفطر، نفقات، وراثت، خراج وجزیہ کے ذریعے سے تعاون کیا جائیگا۔

اسلام کا نظام معاشرت

Islamic Dealing System

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق انسان مدنی الطبع ہے یعنی انسان اپنی زندگی میں اجتماعی زندگی کا محتاج ہے۔اجتماعیت کے بغیر اس کے لیے زندگی گزارنا ناممکن ہے اس لیے کہ وہ اپنی پیدائش سے لے کر موت تک سماج (معاشرہ) کا محتاج ہے۔دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے اور پرورش کیلئے اسے دوسرے لوگوں (ماں ، باپ، بہن، بھائی ، رشتہ دار) کی ضرورت پڑتی ہے ۔ پھر ہوش سنبھالتے ہی اسکاسوسائٹی وبرادری، محلّہ وبستی، شہر وقوم اور تمدن وتہذیب کے نظام سے واسطہ پڑتا ہے۔نیز اپنی ضروریات مثلاً خوراک ولباس اور مکان اور زندگی کے ہر شعبے میں وہ جماعت کا مُحتاج ہے۔

اگر اسکے وہ تمام تعلقات ختم کردیئے جائیں جو جماعت وسماج اور معاشرہ کی بدولت اسے حاصل ہیں تو پھر اسکے پاس کچھ نہیں رہتا اور اسکی حیثیت ختم ہو جاتی ہے ۔الغرض معاشرے کے بے شمار روابط جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں، انہی کی مضبوطی پر ایک فرد ، معاشرے اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے۔اس لیے اسلام کی نظر میں معاشرے کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔اللہ کریم نے معاشرے کی درستگی کے لئے مستقل سورتیں نازل فرمائی ہیں جیسے سورۃ النساء ، حجرات ،احزاب ،وغیرہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسلام کے اکمال کا مدار فرمایا ہے کیونکہ اسلام ایک جامع نظامِ حیات ہے اور اسکا ایک بہت اہم جزء حسنِ معاشرت بھی ہے۔

اسلامی معاشرہ:

اسلام انسانوں کیلئے ایک صحیح منصفانہ اور پائیدار نظامِ معاشرت رکھتا ہے جس کے اُصول وضوابط مستقل ومحکم اور عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔یہ ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر نظام ہے جو زندگی کے تمام شعبوں اور ہر قسم کی سرگرمیوں کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہے۔یہ انسان کے قلب وضمیر اور اسکی زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات پر محیط اور اپنی ہدایت و قانون سازی میں دین و دنیا دونوں پر حاوی ہے۔ معاشرہ چونکہ افراد کے مجموعے کا نام ہے اس لیے اسلام نہ تو اشتراکی معاشروں کی طرح فرد کی آزادی کی قدر و قیمت ختم کرکے زبردستی آمریت

قائم کرنا چاہتا ہے، جس سے فرد کی حیثیت ختم ہو کر ایک مشینی پُرزے سے زیادہ نہیں رہتی اور اس کی وجہ سے اسکی بہت سی انفرادی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور نہ مغربی سرمایہ دارانہ اور سیکولر معاشرہ کی طرح فرد کو مکمل آزاد کرکے اپنی ذاتی ترقی کیلئے معاشرے اور اجتماعیت کو نقصان پہنچانے کا موقع دیا جاتا ہے بلکہ اسلام ان دونوں نظاموں کے مقابلے میں ایک تیسرا معتدل نظام پیش کرتا ہے جو فرد و جماعت کے اندر ایک معتدل توازن قائم کرتا ہے۔ اسمیں ایک طرف تو فرد کو جداگانہ حیثیت حاصل ہے، کیونکہ وہ اس کا ایک بہت اہم جزء ہے جو پوری طرح اپنی صلاحیتں کام میں لانے کا حقدار ہے اور اس فرد میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اللہ رب العزت کے سامنے اپنی انفرادی زندگی کا جواب دہ ہے۔ احساسِ ذمہ داری کے بعد یہ بھی ایک ضروری امر ہے کہ وہ اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت پر اپنا ایمان برابر تازہ کرتا رہے۔ اسلام ایک طرف فرد کو تسلیم کرتا ہے، لیکن دوسری طرف اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کیلئے بھی واضح ہدایات دیتا ہے اور فرد پر ایسی پابندیاں لگاتا ہے کہ اسکی ذاتی ترقی و مفاد معاشرے کیلئے نقصان اور اجتماعی ترقی میں رکاوٹ کا باعث نہ بنیں۔ اسلام کے نظامِ معاشرت کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ تمام انسانیت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے رنگ و نسل، حسب ونسب، قوم قبیلہ کی تفریق وامتیاز اور اُونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے۔ یہ فطری تقسیم تو صرف باہمی تعارف کیلئے ہے اگر کوئی فرق وامتیاز ہو سکتا ہے تو وہ نظریات و خیالات، اعمال، اخلاق اور تقوٰی کا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ [حجرات ۱۳]

"بے شک تم میں سے اللہ کے ہاں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو"۔

اسلامی معاشرہ کی عمارت انسانی مساوات و اخوت، اجتماعی عدل و انصاف اور ایثار و خیر خواہی کے جذبے، ذمہ داری کے شعور، ایک دوسرے کے حقوق و فرائض اور موقع و محل کی مناسبت سے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے، آنے جانے وغیرہ کے آداب جیسی ٹھوس بنیادوں پر قائم اُصولی اور فطری معاشرہ ہے جو فرد و ملت کے امن کا ضامن ہے۔

اسلام امن و محبت کا داعی ہے اور صلح و آشتی کا پیامبر مذہب ہے۔ اس کا نظام زندگی امن و انصاف اور اخوت و مساوات سے عبارت ہے۔ اس کے یہاں رنگ و نسل اور برادری کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں۔

انسانی مساوات کا ایسا تصور جو اس کے ہاں موجود ہے جسکی دنیا کے کسی اور مذہب میں نظیر نہیں ملتی۔ عزت و شرف کا حقیقی معیار اس کی نظر میں صرف حسنِ عمل اور اخلاق و کردار ہے۔ ظلم و تشدد اور فساد و خون ریزی سے اسے نفرت ہے۔ انسانیت کے قتلِ ناحق اور خونِ بشر کی پامالی سے اس کا دامن پاک ہے۔ وہ سراپا محبت ہے اور آدابِ محبت سکھاتا ہے۔ وہ امن کا حامی ہے اور امن وامان کی تلقین کرتا ہے۔ ظلم کی ظلمتوں میں وہ محبت کا چراغ اور فتنہ و تشدد کی آندھیوں میں امن کی شمع فروزاں ہے۔ ایک مسلمان اپنے مذہبی تصورات اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں سب سے زیادہ امن پسند اور دوسروں کے لیے امن کا داعی ہوتا ہے۔

اسلام نے تمام انسانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ اور فتنہ و فساد کی سرکوبی کے لیے مستقل قوانین وضع کیے اور انسانیت کی اصلاح و فلاح کے لیے اُصول زندگی کی رہنمائی کی ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان کی جان اور زندگی کی سلامتی ایک اہم ترین حقِ انسانی ہے، ناحق قتل خواہ کسی بھی انسان کا ہو، قرآن کی نگاہ میں سخت ترین گناہ ہے اور گویا ایک انسان کا قاتل پوری انسانیت کا قاتل ہے۔

مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا

[مائدہ: ۳۲]

"جو کوئی کسی کو کسی جان کے عوض یا زمین پر فساد کے عوض کے مار ڈالے تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو مار ڈالا۔"

اور ایسے قاتل کے لیے جہنم کی ابدی سزا کا اعلان کیا گیا:

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا [نساء: ۹۳]

"اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور خدا اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کے لئے اس نے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

مالی معاملات کے سلسلے میں ہدایت یہ ہے کہ کسی کا مال حرام و ناجائز طریقے سے ہڑپ کرنے کی کوشش نہ کی جائے، حکم باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ [البقرۃ: ۱۸۸]

"آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ اور مت اڑاؤ"۔

قرآن میں چوری اور ڈکیتی کی سزا کا ذکر بھی موجود ہے تاکہ انسانی معاشرہ کسی بدامنی کا شکار نہ ہونے پائے اور لوگوں کو جان و مال کا تحفظ فراہم ہو۔

اسلام نے انسان کی عزت و آبرو کا بھی تحفظ کیا ہے اور کسی کی عزت و آبرو پامال کرنے کو کبیرہ گناہ قرار دیا اور زنا کی سخت ترین سزا مقرر کرتے ہوئے اس کے قریب تک جانے سے بھی منع کیا:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا [بنی اسرائیل: ۳۲]

"اور زنا کے قریب بھی مت جانا بیشک یہ ایک بے حیائی ہے"

یہاں تک کہ کسی ثبوت شرعی کے بغیر کسی عفیف و پاک دامن عورت یا مرد پر تہمت لگانا بھی جرم قرار دیا گیا۔

قیامِ امن کا ایک بنیادی تقاضا یہ بھی ہے کہ انسانوں کے درمیان ظلم و ناانصافی کا خاتمہ کیا جائے کیونکہ جب ظلم و سرکشی بڑھتی ہے تو پھر دنیا اور معاشرے سے امن و امان رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شریعت میں ظلم کو حرام قرار دیا ہے:

وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ [نحل: ۹۰]

"بے شک اللہ تعالیٰ مطلق بُرائی اور ظلم و سرکشی سے ممانعت کرتا ہے"۔

ظلم کے مقابلے میں اسلام نے "عدل" کی تعلیم دی ہے۔ عدل سے حقوق کی پاس داری اور تکمیل ہوتی ہے۔ عدل صرف نظمِ سلطنت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے۔ عدل کی حقیقت یہ ہے کہ ہر صاحبِ حق کا حق پورا ادا کیا جائے، اس کے عموم میں اللہ کے حقوق بھی داخل ہیں اور تمام اقسام کے انسانی حقوق بھی۔ یہ مفہوم بھی داخل ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور یہ بھی کہ ظالم کو ظلم سے روکا جائے اور مظلوم کی حمایت کی جائے۔ انبیائے کرام علیہ السلام کی بعثت اور کتب و صحائفِ سماویہ کے نزول کا مقصد یہی تھا کہ معاشرہ میں انصاف اور اس کے ذریعے امن و امان قائم ہو، ہر فردِ انسانی اپنے اپنے دائرہ اختیار میں انصاف کو اپنا شعار بنالے۔ قرآن کی تمام تعلیمات عدل کے اُصول پر مبنی ہیں، ہر قوم کے انسانی اور سماجی حقوق کا تحفظ اسی راہ سے ممکن ہے۔ اسی لیے قرآن کی بے شمار آیات میں عدل کی تعلیم اور ظلم کی مذمت کی گئی ہے۔

معاشرے کی اصلاح کے ضمن میں انسانی مساوات کے تصور کی بڑی اہمیت ہے، جب انسانوں کے درمیان اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق کیا جانے لگے، ذات پات اور برادری کے علاوہ رنگ زبان کے مختلف خانوں میں انسانوں کو بانٹا جائے تو باہمی کشمکش اور نفرت و عداوت کی فضاء پیدا ہونا نا گزیر ہے۔ جس کی بنیاد پر نقضِ امن اور عدم تحفظ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام نے رنگ و نسل اور زبان و وطن کے بتوں کو توڑا، انسانوں کے درمیان کسی بھی طرح کے بھید بھاؤ اور تفریق کو مٹایا اور تمام انسانوں کو اولاد آدم ہونے کی حیثیت سے یکساں قرار دیا اور عزت و سربلندی کا معیار صرف تقویٰ اور خدا ترسی ٹھہرایا۔

۱۔ آج معاشرہ پھر ظلم و فساد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، طاقت ور کا زور ہے اور کمزور بے بس۔

۲۔ دولت مند غریبوں کا استحصال دولت و طاقت کی بنیاد پر ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ آور ہے، امن کے دعوے دار ہی اصل غارت گرِ امن ہیں، صلح و سلامتی کے نام نہاد علم بردار ہی مہلک ہتھیاروں کے سوداگر ہیں۔

۳۔ یوں تو امن اور اصلاحِ معاشرہ کے نام پر بے شمار ادارے اور جماعتیں موجود ہیں، مگر پھر بھی دنیا امن کے لیے بے چین ہے۔ ایسے حالات میں یہ ضروری ہے کہ قرآن اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نظامِ امن سے روشنی حاصل کی جائے اور اسلام کے امن پسندانہ نظامِ معاشرت کو مشعلِ راہ بنایا جائے۔ امن کی پیاسی دنیا کا اضطراب اسی راہ سے دور ہو سکتا ہے، جس راہ سے دنیا ظلم کی تنگیوں سے نکل کر اسلام کے عدل کی طرف پلٹ آئی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ اسلامی نظامِ معاشرت کو وسیع پیمانے پر متعارف کرائیں اور دنیا کو یہ پیغام دیں کہ اسلام ہی دنیا کی موجودہ مشکلات کا واحد حل ہے اور اسی کے سہارے دنیا امن بداماں ہو سکتی ہے اس لیے حکم یہ ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔ [نحل: ۹۰]

"بیشک اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور رشتہ داروں کو حق دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی، منکر اور ظلم سے منع کرتا ہے اور نصیحت کرتا ہے تم کو تاکہ تم نصیحت حاصل کرلو"

اسلامی نظامِ معاشرت کی اہمیت کو سمجھنے کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ وہ کونسے اصول اور طریقے ہیں جو کہ اسلام انسانی میل ملاپ اور ہم آہنگی پیدا کرنے اور صحیح معاشرہ قائم کرنے کیلئے مقرر کرتا ہے۔ معاشرہ کے مندرجہ ذیل ارکان ہیں۔

خاندان/ گھرانہ:

اسلامی معاشرے کا اولین وبنیادی ادارہ خاندان ہے۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد و عورت کے شرعی طریقہ پر نکاح کے باہمی تعلق سے پڑتی ہے۔ اسی شرعی ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ پھر اس سے رشتے، کنبے، برادری کے تعلقات پیدا ہو کر پھیلتے پھیلتے ایک وسیع معاشرے تک پہنچ جاتے ہیں گویا کہ یہ ادارہ (خاندان) ہی انسانی تمدن کی جڑ اور تربیت گاہ ہے۔ اس لیے اسلام نے باہمی حقوق وفرائض زوجین، والدین اور حقوق اولاد کی تاکید کی ہے۔ تاکہ معاشرے کے اس اولین ادارے کی اصلاح ہو اور اچھے انسانوں کا ایک صحیح ترین معاشرہ وجود میں آئے۔

قرابت:

خاندان کے بعد رشتہ داری ہے۔ جسکا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ جو رشتے ماں اور باپ کے تعلق سے یا بھائی بہنوں سے یا سسرالی تعلق سے قائم ہوئے ہوں وہ تمام ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ اسلام ان سب کو ایک دوسرے کی ہمدردی، مددگاری، غم خواری اور آپس کے باہمی حقوق وفرائض کا خیال رکھنے کا سبق دیتا ہے قرآن مجید میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک اور صلہ رحمی قائم کرنے کی تاکید ہے اور ساتھ ہی وراثت کا حق بھی دیتا ہے لیکن اسکا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ ایک دوسرے سے اسلام کے خلاف کاموں اور ناجائز چیزوں میں تعاون کریں بلکہ ان سے مراد وہ تعلق وصلہ رحمی ہے جو عدل وانصاف کی حدود کے اندر ہو۔

محلّہ، ہمسائیگی، شہریت:

قرابت کے بعد محلّہ یعنی ہمسائیگی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے خواہ وہ ہمسایہ رشتہ دار ہو یا اجنبی، عارضی یعنی شریک سفر، درس و جماعت ہو یا دوست ہو اسکے حقوق کا خیال رکھنا لازم ہے۔ اسلام پڑوسیوں کو باہم ہمدردی، مددگاری، شریکِ رنج وراحت ہونے کا حکم دیتا ہے تاکہ یہ ایک دوسرے پر بھروسہ کرکے اپنی جان و مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ مسلمان پر بحیثیتِ شہری بھی چند حقوق وفرائض عائد ہوتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہر حالت میں اپنے معاشرے کی بہتری کی فکر کرتا رہے، ہمیشہ انسانی فلاح و بہبود اور دینداری کیلئے سرگرم عمل ہو، انسانی

مشکلات کو ختم کرنے اور امن وسلامتی کی فضاء قائم کرنے کیلئے کوشاں ہو، بچوں، ضعیفوں اور ناداروں پر رحم کھا کر ان کی مدد کرتا ہو۔

مسجد:

معاشرتی تعلقات کو استوار کرنے کیلئے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی سی ہے اور اسلام کا معاشرتی پروگرام مسجد ہی کے ذریعے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مسجدوں کی صحیح تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے تاکہ مطلوبہ نتائج پوری طرح حاصل ہو سکیں اور مساجد کی سطح پر اصلاح عقائد و اعمال اور اصلاحِ معاشرہ کی تعلیم وتربیت کا بندوبست ہو اور لوگوں کو قرآن وسنت سے روشناس کیا جائے۔اسکے ساتھ ساتھ دوسرے اجتماعی ادارے مثلاًمدارس، حجرہ اور دوسری جگہوں وغیرہ کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔اس لیے ان تمام اجتماعی جگہوں کے حقوق وآداب کا خیال رکھنا چاہیے۔

تعلیم:

معاشرے کو سدھارنے ،اسمیں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے تجربات زندگی کی نئی نسلوں کی طرف منتقلی میں علم اور صحیح نظامِ تعلیم کی بنیادی اہمیت ہے اور یہ اسلامی معاشرے کا ایک بہت بڑا ستون ہے۔نظامِ تعلیم کے اولین نصاب میں قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا اور اپنی زبان میں اسکا معنی و مقصد سمجھنا بہت ضروری ہے کیونکہ قرآن اور دین کی تعلیم سے ہی انسان صحیح عقیدہ اور اخلاق واطوار وغیرہ حاصل کر سکتا ہے۔پس مختصر الفاظ میں حقوق اور آداب کو معاشرہ کہتے ہیں۔اور معاشرت کا اصل اصول یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کی دل آزاری سے بچا جائے اور ان کا حق ادا کرنے اور ان کو خوش کرنے، خوش رکھنے اور ان کے حق کے مطابق ان کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے لیکن اس ضمن میں شریعت کے حدود میں رہنا اور اس کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔

اسلام کا نظامِ سیاست وریاست

Islamic Politics & statesmanship System

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جس میں سیاست و ریاست کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اس بارے میں بھی اسلام نے واضح ہدایات جاری کر رکھے ہیں۔ اسلام اور سیاست کا جولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلام اور حکومت وریاست لازم وملزوم ہیں۔ اسلام دین ودنیا کے مابین تفرق کا قائل نہیں۔ اسلام تو پوری زندگی کو اللہ کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کیلئے سیاست کو اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے۔

اسلام کے بغیر سیاست وریاست اور حکومت ظلم وبے انصافی اور چنگیزیت ہے۔

بقول اقبال رحمہ اللہ:

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جب مسلمانوں نے سُلطان محمد فاتح رحمہ اللہ کی قیادت میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو اس وقت عیسائیوں کے دو گروہوں رومن کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ کے درمیان اس بات پر جھگڑا اور مناظرہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی عمر میں میدہ کی روٹی کھائی ہے یا نہیں۔ وہ انہی جھگڑوں میں مصروف تھے کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ پھر ان کے درمیان آپس میں اسی طرح کے معمولی مسائل پر جھگڑے ہوتے رہے اور دونوں طرف بہت قتل عام ہوا اگر حکومت کیتھولک کی ہوتی تو پروٹیسٹنٹ کو قتل کرتے اور اگر حکومت پروٹیسٹنٹ کی ہوتی تو کیتھولک کو قتل کرتے۔ پھر عیسائیوں نے ان جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے مذہب اور سیاست وحکومت کو جدا کر دیا اور پادری کو گرجا میں بند کر دیا اور اعلان کیا کہ مذہب کا تعلق صرف گرجے کے ساتھ ہوگا۔ مذہب کا حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ حکومت مذہب سے جدا چیز ہے اور ہر گروہ ومسلک والے اپنے اپنے مذہب ومسلک کے مطابق زندگی گزاریں۔ اتواللقیصر ما للقیصر واللہ ما للہ۔ حکومت کا معاملہ حکومت کے ساتھ اور اللہ کا معاملہ اللہ کے ساتھ۔ یوں اُن کے باہمی جھگڑے ختم ہو گئے اور حکومت آزاد ہو گئی۔ یہیں سے جمہوریت نے جنم لیا۔ سیاست اور دین کی جدا جدا حیثیت ہونے کا تصور دنیا میں عام ہونے لگا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ نظریہ

اور خیال عیسائیوں کا ہے اگر ان کے دین و مذہب میں حکومت نہیں تو نہ ہوگی کیونکہ ان کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام نے حکومت نہیں کی تھی۔ اسلام میں سیاست اور حکومت بھی مذہب اور دین پر بنا ہے، ایک دوسرے سے جدا نہیں، کیونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے مسئلہ خلافت امتِ مسلمہ نے حل کیا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا اور ان کے علاوہ سات دیگر صحابہ کرامؓ جن میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حسن بن علی رضی اللہ عنہ، امیر معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شامل ہیں، نے حکومت کی اور پھر یہی حکومت و خلافت تابعین و تبع تابعین رحمہم اللہ میں جاری رہی۔

اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَكُوْنُ اِثْنَا عَشَرَ اَمِيْرًا [بخاری: ۲/۱۰۷۲] "میرے بعد بارہ امیر ہوں گے"۔

اور فرمایا: نَبُوَّةٌ وَ رَحْمَةٌ ثُمَّ خِلَافَةٌ وَ رَحْمَةٌ [بزاز]

"یعنی میری نبوت کے بعد خلافت ہوگی"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیائے کرام علیہ السلام نے بھی زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کی جدوجہد کی تاکہ اللہ کی زمین پر اللہ کا دین کامل اور اسی کا قانون نافذ و جاری ہو۔ انکی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی۔ان پاک ہستیوں نے ایمان اور عقیدۂ توحید کے بیان کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں جو بھی منکر و بے اعتدالی دیکھی خواہ اخلاقی ہو یا معاشی یا سیاسی اس کی اصلاح پر توجہ دی اور اصلاح عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات معاشرت کے ساتھ ساتھ سیاست و ریاست کی اصلاح پر بھی بہت زور دیا۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ:

كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ

"بنی اسرائیل کی سیاست انبیائے کرام علیہ السلام کیا کرتے تھے۔"

بنابریں قرآنی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی طرزِ سیاست و خلافت قائم کی جسے بعد میں خلفائے راشدین رضوان اللہ اجمعین نے اسی معیاری شکل میں انبیائے کرام علیہ السلام

کے اسوۂ حسنہ کے مطابق جاری رکھا۔ یہاں اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ سیاست سے ہماری مراد موجودہ مغربی و جمہوری سیاست نہیں، بلکہ خالص اسلامی سیاست و ریاست مراد ہے۔

اسلامی سیاست:

سیاست کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں جبکہ شریعت کی اصطلاح میں سیاست القوم سے مراد قوم کو جملہ دینی و دنیاوی ضروریات مہیا کرنا ہے، انہیں مصائب سے بچانا اور انکی کامرانی و منفعت کیلئے جملہ تدابیر، دنیوی واخروی سعادت و بھلائی کیلئے جدوجہد اور مفید وسائل اختیار کرنا سیاست ہے۔

چونکہ سیاست و ریاست دینِ اسلام کا اہم جز ہے اس لیے اس کو قرآن وسنت، اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طریقے پر کرنا ضروری ہے جو کہ صدق و سچائی کی بنیاد پر استوار ایک اُصولی سیاست ہے اور اگر سیاست اس طریق پر نہ ہو تو وہ دین نہیں بلکہ بدعت و خباثت رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ موجودہ دور میں نام نہاد سیاسی پارٹیوں نے جھوٹ، دھوکہ اور وقتی مصلحتوں پر مبنی سیاست شروع کر رکھی ہے اور اسے اسلامی سیاست کا نام دیا ہے۔

اسلامی سیاست کی بنیاد تین اُصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یعنی توحید، رسالت اور خلافت۔ ان اصولوں کو سمجھے بغیر اسلامی سیاست کے تفصیلی نظام کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے پہلے انکی مختصر تشریح ضروری ہے۔

توحید و رسالت:

توحید کے معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں میں بسنے والی مخلوق کا خالق، پروردگار اور مالک ہے۔ حکومت و فرمان روائی اُسی کی ہے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے کا حق رکھتا ہے۔

الوہیت، بندگی و اطاعت اور حاکمیت بلا شرکتِ غیرے اسی کیلئے ہے۔ ہماری یہ ہستی جس کی بدولت ہم موجود ہیں، یہ جسمانی آلات و طاقتیں جن سے ہم کام کرتے ہیں، اور وہ اختیارات جو ہمیں دنیا کی موجودات پر حاصل ہیں، ان میں سے کوئی بھی چیز نہ ہماری پیدا کردہ ہے نہ ہی حاصل کردہ ہے اور نہ ہی اس خالقِ دو جہاں کی عطائی میں اسکے ساتھ کوئی شریک ہے۔ اس لیے اپنی ہستی کا مقصد، اپنی قوتوں کا مصرف اور اپنے اختیارات کی حدود و قوانین مقرر کرنا نہ تو ہمارا کام ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کا حق ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے جو کہ ہمارا خالق اور ہمیں اختیارات عطا کرنے والا ہے۔

توحید کا یہ اصول انسانی حاکمیت کی سرے سے نفی کرتا ہے۔خواہ وہ ایک انسان ہو، خاندان ہو یا ایک گروہ و طبقہ، حاکمیت کا حق کسی کو بھی نہیں پہنچتا۔حاکم صرف اللہ ہے اور اسی کا حکم قانون ہے۔

اللہ کا حکم جس شخص کے ذریعے سے بندوں تک پہنچتا ہے اسے رسول کہتے ہیں اور اس کی ڈیوٹی رسالت کہلاتی ہے اور رسالت کے ذریعے ہمیں دو چیزیں ملتی ہیں۔ایک کتاب جس میں خود اللہ تعالیٰ نے قانون بیان کیا ہے اور دوسرا اس کتاب کی مستند تشریح جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے قول و فعل (احادیث وسنت) کے ذریعے پیش کی ہے انہی دو چیزوں کے مجموعے کا نام اسلامی اصطلاح میں "شریعت" ہے اور یہی وہ اساسی دستور ہے جس پر اسلامی ریاست وخلافت قائم ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست (خلافت):

خلافت کا مطلب ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا مامور ہے یعنی اللہ کی طرف سے اِس کی مملکت میں دیئے گئے اختیارات اسی کی مرضی اور قانون کے مطابق استعمال کرنا ہونگے۔اسلام زمین پر انسان کو خلیفہ قرار دیتا ہے جو دراصل اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرکے اسی کی حاکمیت کے تحت خلافت کریگا اور اسکے مقرر کردہ قوانین وحدود کے اندر رہ کر نظامِ خلافت چلائے گا، کیونکہ منصبِ نبوت مختلف اجزاء سے مرکب ہے۔ مِن جملہ ان میں سے ایک جز وحی اور شریعت میں تشریح و تاسیسِ قوانین یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع وقیام کی معصومانہ وغیر مسئولانہ قوت تو اس جز کے اعتبار سے نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر ختم ہو چکی ہے اور قیامت تک کے لیے شریعت و قانون وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا ہے۔جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا ہوتا ہے۔اب اس کی جگہ کسی دوسری چیز (قانون) کا آنا نقص ہوگا نہ کہ تکمیل، لیکن منصبِ نبوت اس اصلی جز کے ساتھ بہت سے تبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا اور ضروری تھا کہ ان کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا رہے اور وہ ہے خلافت۔ پس خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور امرائے اسلام کو جو نیابت پہنچی اس میں وحی و تشریع کی قائم مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی، لیکن ان میں باقی تمام اجزاء وخصائصِ نبوت کی نیابت یقینی طور پر داخل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک نبوت کے ساتھ ساتھ خلافت ارضی، حکومت وسلطنت، نظام وقوام، سیاست، قیادتِ فوج وحرب، فتح وعمرانِ ممالک وریاست

وغیرہ تمام اوصاف کی حامل تھی۔اس لیے ٹھیک اسی طرح خلفاء راشدین بھی اپنی مثال آپ تھے۔ وہ صاحبِ خلافت بھی تھے ، صاحبِ اجتہاد و قضاء بھی اور صاحبِ سیاست و نظمِ احکام ریاست بھی اور پھر یہی صفات و کمالات دوسرے امرائے اسلام میں بھی ہونے چاہئیں۔اسلام کا نظامِ ریاست نہ تو موجودہ غلط مغربی جمہوریت کی طرح ہے اور نہ ہی بادشاہت وآمریت کی طرح بلکہ وہ ایک صحیح معتدل و منصفانہ شورائی نظامِ خلافت پر قائم ہے۔جو ایک شورائی نظام کے تحت چلتی ہے۔

مجلس شوریٰ اسلامی نظامِ حکومت کا ایک اہم ستون ہے جس کے بغیر خلافت نہیں چل سکتی ہے۔قرآنِ کریم میں ارشاد ہے :وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ [عمران: ۱۵۹]

"اور ان سے مشورہ لیتے رہا کیجیے۔"

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ [شوریٰ: ۳۸]

"اور انکا ہر کام مشورہ سے ہوتا ہے۔"

اسلامی شوریٰ ایک کمیٹی پر مشتمل ہوتی ہے جس کے ارکان علماء ، صلحا، صاحبُ الرائے، اور دین ودنیا کو سمجھنے والے ہوتے ہیں۔اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، واضح احکامات و قوانین کے علاوہ جنہیں کوئی مجلسِ قانون ساز تبدیل نہیں کر سکتی کے علاوہ ایسے معاملات جن میں شریعت نے کوئی واضح حکم نہیں دیا ہو ایسے تمام معاملات میں مجلسِ شوریٰ قرآن وسنت اور اقوالِ صحابہؓ وائمہؒ کی روشنی میں قانون بنا سکتی ہے۔یہی مجلس امیر کا انتخاب اِن شرائط کے تحت کر سکتی ہے جو ایک خلیفہ اور امیر کیلئے قرآن و سنت اور فقہ نے بتائی ہیں۔اسکے ساتھ ہی اگر خلیفہ اپنی ذمہ داریاں کو درست طریقے پر سرانجام دینے کا اہل نہیں ہے تو خلیفہ کو سمجھایا جائے گا بصورت دیگر مجلسِ شوریٰ خلیفہ کو معزول کرنے کا حق رکھتی ہے۔

اسلامی حکومت کے امتیازی اصولوں میں سے ایک یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جو شخص خود کسی حکومتی عہدے کا خواہشمند ہو اُس کو کسی بھی عہدے کے لئے تعینات نہیں کیا جاتا۔ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خاندان کے دو آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی حکومتی عہدے کے لئے درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَنَا وَاللّٰہِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلَ اَحَداً سَاَلَہٗ وَلَا اَحَداً حَرَصَ عَلَیْہِ [بخاری و مسلم]

"اللہ تعالیٰ کی قسم ہم کسی ایسے ادمی کو حکومتی عہدہ سپرد نہیں کرتے جو اس کے لئے خود طالب اور حریص ہو"

عام اصول تو یہی ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہے، لیکن اگر کوئی مخلص بندہ کسی خاص موقع پر محسوس کرے کہ اس اہم خدمت کو اللہ کی توفیق سے میں اچھی طرح انجام دے سکتا ہوں تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ خود کو پیش کرے۔اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ حکومتی عہدیدار پر آسائش زندگی گزارنے سے پرہیز کریں گے بلکہ انہیں حکم ہے کہ ان کی زندگی کا معیار زیادہ بلند نہ ہو۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ وہ جب عمال کو کسی عہدے کا چارج لینے کے لئے رخصت کرتے تو ان پر پابندی لگادیتے تھے کہ "وہ اپنے علاقۂ حکومت میں ٹھاٹھ باٹھ سے نہ رہیں۔ سواری اور کھانے میں بھی بڑے لوگوں کا طریقہ اور فیشن اختیار نہ کریں اور اگر وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی کریں گے تو نااہل قرار دیئے جائیں گے اور سزا کے مستحق ہونگے۔"

اسلامی ریاست وخلافت کے مقاصد وخواص اور ذمہ داریاں :

قرآن کریم نے اسلامی ریاست کی ضرورت اور تشکیل کا مقصد یہ بتایا ہے کہ اسکے ذریعے اللہ کے نازل کردہ احکام و قوانین کو عملاً نافذ کیا جائے۔اللہ کی عبادت کا نظام یعنی نظام صلوٰۃ وزکوٰۃ قائم ہو اور نیکی کی اشاعت اور برائی کی روک تھام کیلئے حکومت کی قوت کو استعمال میں لایا جائے۔ چنانچہ فرمان الٰہی ہے: اَلَّذِينَ إِنَّ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ [حج :۴۱]

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں"۔

- اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت واقتدار صرف اسلئے مطلوب ہے کہ اللہ پرستی کو فروغ دیا جائے، نیکوکاری پھیلے اور ترقی کرے اور بدکاری، بداخلاقی کا خاتمہ ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلامی حکومت کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جو بھی انتظامات ضروری ہوں وہ ممکن حد تک بروئے کار لائے جائیں، مثلاً اس مقصد کا تقاضہ جس قسم کے نظام تعلیم کیلئے ہو وہ تعلیمی نظام قائم کریں اور اسی طرح اپنی ساری کارروائیوں میں بطور نصب العین کے اس مقصد کو سامنے رکھے۔ علیٰ

ہذا القیاس ارشاد و احتساب اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کا محکمہ قائم کرے، وقت آجانے پر اپنی حفاظت کے لئے اور اعلاء کلمتہ اللہ کے لئے مقرر شرائط کے ساتھ جہاد کرے۔

- اسلامی ریاست کا دوسرا مقصد امن وامان اور عدل و انصاف کا قیام ہے ۔جو اسلامی ریاست کے اولین فرائض میں سے ہے تاکہ رنگ ، نسل ،ملک یا علاقیت کے رشتوں سے بالاتر ہو کر انسانی مساوات ،عدل وانصاف او رتصورِاخوت قائم ہواور تمام فیصلے انصاف و عدل پر مبنی ہوں اورانصاف کا ایسا انتظام ہو کہ ہر ایک کے لئے اس کا حاصل کرنا آسان ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم جن لوگوں کو کسی علاقے کا حاکم یا جج مقرر کرتے تھے تو ان کو ایک خاص تاکید یہ بھی فرماتے تھے کہ انصاف کے طالبوں اور داد خواہوں کے لئے ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہے اور دروازے پر کوئی دربان بھی نہ رہے، نیز انصاف بالکل بے لاگ ہو، نہ تعلق اور یگانگت کی بناء پر اور نہ کسی دوسری وجہ سے کسی کے ساتھ خلاف انصاف کوئی رعایت ہو اور نہ مخالفت یا عداوت کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی یا بے انصافی ہو، ساتھ ہی حقوق و فرائض کی واضح تقسیم ہو ۔انسانی خون ہر حالت میں محترم رہے اور بے جانہ بہایا جاسکے۔ عورتوں کی عصمت بہر حال محفوظ ہو اور انہیں بے آبرو نہ کیا جاسکے ،سب اپنے آپ کو امن و حفاظت میں سمجھیں اور ان کی جان و مال اور عزت وآبرو محفوظ رہے۔ مختصر یہ کہ عام شہریوں کو ان کے جائز حقوق کا مستحق قرار دیا جاسکے۔
- اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہوتی ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔اسلامی حکومت کی حیثیت چونکہ ایک ایسے انتظامی اور تولیتی ادارے کی ہے جو دراصل اللہ کی طرف سے اس کے ملک اور اس کی رعیت کا انتظام کرنے کا ذمہ دار ہے۔اس لئے اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے وسائل کی حد تک اس کی پوری پوری فکر اور کوشش کرے کہ اس کے زیر انتظام سارے بندوں کو (بلا تفریق مذہب وملت) زندگی کی ضروریات حاصل ہوں اور کسی بھی طبقے پر کوئی نامناسب بوجھ نہ پڑے۔ مملکت کے غریب و نادار اور معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کی دادرسی اسلامی ریاست کا اہم فریضہ ہے۔اس سلسلہ میں زکوۃ و صدقات وغیرہ

کی شکل میں مال، دولت مندوں سے حاصل کرکے حاجت مندوں کی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ رضی اللہ عنہم کے مثالی دور میں ان تمام ذمہ داریوں کی ادائیگی کی جس طرح فکر و کوشش کی جاتی تھی اس کی تفصیلات کتب سیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

- اس کے علاوہ حدود و تعزیرات کا نفاذ بھی اسلامی ریاست کا اہم فریضہ ہے جس کے ذریعے معاشرے کو ان مضرات سے محفوظ کیا جاتا ہے جو تعلیمی، ترغیبی اور اخلاقی ذرائع سے اصلاح قبول نہ کریں اور قانون کی خلاف ورزی کریں، ایسے لوگوں کیلئے اسلام نے سزائیں مقرر کی ہیں اسلام میں سزائیں تین قسم کی ہیں

(۱) قصاص (۲) حدود (۳) تعزیرات۔

مسلمانوں کی کوتاہی:

الغرض اسلامی نظامِ خلافت و ریاست ہی وہ فطری حکومت ہے جو اللہ کے واضح احکام کی روشنی میں انسانوں کی دنیوی واخروی کامیابی کا ضامن ہے، لیکن افسوس کہ آج مسلمانوں نے غیر شرعی نظام کو گلے کا طوق بنایا ہے جس کے اتارنے کے لئے مسلمان تیار ہی نہیں۔ مسلمانوں کی غیرت ایمانی ہے کہ جاگنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ مسلمان صرف صوم و صلوۃ پر اکتفا کئے ہوئے ہیں اور اسی کو ہی کامیابی کے لئے کافی تصور کرتے ہیں یہاں تک کہ ممبر و محراب میں بھی اس غیر شرعی قانون کے خلاف بولنے کی سکت نہیں۔ جو شخص کسی بھی غیر اللہ کو (خواہ وہ حکومت ہو یا کسی کی شخصیت) یہ حق عطا کردے کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال ٹھہرادے اور جس چیز کو چاہے حرام قرار دے۔ جس چیز سے چاہے منع کردے اور جس چیز کی چاہے اجازت دیدے تو وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ امر و نہی کا حق اور حاکمیت مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ہے اور اس میں کسی کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح سے قانون بنانے کا حق بھی صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ [اعراف ۵۴]

"خبردار سب مخلوق اللہ کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے"۔

اور اللہ کے ہاں اسلام کے قانون اور شریعت کے علاوہ کوئی دوسرا نظام اور قانون پسند ہی نہیں:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ [العمران: ۸۵]

"جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا، اس کا یہ دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔"

بعض ایسے بھی ہیں کہ وہ اسلام اور اسلام کے نفاذ کا نام تو لیتے ہیں، لیکن وہ اس میں مخلص نہیں یا اس کے نفاذ کے لیے غلط راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں یا اسلام کے حقیقی مفہوم سے ہی بے خبر ہیں۔ اس طرح مغربی جمہوریت کا بھی اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ [انعام: ۱۱۶]

"اور اکثر لوگ جو زمین پر آباد ہیں (گمراہ ہیں) اگر تم ان کا کہا مان لوگے تو وہ تمہیں خدا کا رستہ بھلا دیں گے"۔

اللہ تعالیٰ نے اکثریت و جمہوریت کی تابعداری کو گمراہی قرار دیا ہے۔ اب وہ لوگ جو مطلقاً مغربی جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں اور اکثریت کو اقتدار اعلیٰ سمجھتے ہیں مغربی جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام کو کہا جاتا ہے تو ان کا یہ عقیدہ قران مجید کے اس واضح حکم کے خلاف ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ [یوسف ۴۰]

"حاکمیت اور قانون سازی کا حق تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے"۔

واضح رہے کہ اسلام نظام شوریٰ کی اجازت تو دیتا ہے مگر اس میں حاکمیت صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہوتی ہے۔ اسلام کسی بھی حالت میں اکثریت عوام کو حاکمیت کا حق نہیں دیتا اور نہ وہ نیک اور فاجر کو ایک ہی مقام پر لا کھڑا کرتا ہے جیسا کہ مغربی جمہوریت کا مشاہدہ ہے۔ پس ہر وہ نظام جو غیر اللہ کی حاکمیت کی طرف لے جاتا ہے وہ خالص کفر ہے اس لیے کہ اس میں تشریع اور قانون سازی کا حق غیر اللہ کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے جس کو غیر اللہ حلال قرار دیدے وہ حلال اور جس کو غیر اللہ حرام کہے وہ حرام ہو جاتا ہے جو کہ صریح کفر ہے۔ وہ شخص جو غیر اسلامی قانون یا غیر اسلامی نظام میں اسطرح زندگی گزارتا ہے کہ اس کا ضمیر اس کو جھنجھوڑتا نہیں، اس کے دل میں غیر شرعی قانون کے لئے بے چینی پیدا نہیں ہوتی اور غیر شرعی نظام پر وہ دل اور دماغ کی ہم آہنگی کیساتھ راضی ہے تو اس شخص کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح سے وہ شخص جو کہ اسلامی نظام میں تو زندگی گزارتا ہے لیکن دل میں وہ شرعی قوانین کیخلاف کُڑھتا رہتا ہے اور شرعی قوانین کو وہ خلاف عقل سمجھتا ہے وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ [مائدہ: ۴۴]

"اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت پر فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں"۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ [مائدہ: ۴۵]

"اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت پر فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ ظالم ہیں"

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ [مائدہ: ۴۷]

"اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت پر فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ فاسق ہیں"۔

بعض افراد اس ملک میں اسلام کا نفاذ تو چاہتے ہیں، مگر ماڈریٹ اسلام کا نفاذ، ماڈرن اور جدید اسلام۔ان کے ہاں اسلام کا کوئی نیا ماڈل ہے جو اپنے دامن میں بے انتہا وسعت اور لامحدود امکانات رکھتا ہے۔ درحقیقت یہ مکی اور مدنی اسلام کو فرسودہ قرار دے کر اسلام کا نیا ایڈیشن مسلمانوں کو پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے اس جدید اسلام میں نفس پرستی اور خداپرستی ساتھ ساتھ چلتے ہیں کہ

خوش رہے شیطان بھی اور راضی رہے رحمٰن بھی۔

اس اسلام میں سود کو معیشت کا لازمی جز قرار دیا جاتا ہے اور رقص و سرود کو فنونِ لطیفہ اور ثقافت کا حصہ سمجھا جاتا ہے، بے پردگی کو سندِ جواز فراہم کیا جاتا ہے، مرد و زن کے اختلاط کو جدید تہذیبی روایات کا تقاضا خیال کیا جاتا ہے۔ان کے علاوہ بھی کئی منکرات اور ممنوعات ہیں جنہیں مشرف بہ اسلام کرنے کی اس ماڈرن اسلام میں کافی گنجائش کو روا رکھا جاتا ہے۔

اس طرح بعض نام نہاد مسلمان لبرل سیکولر ذہنیت والے تو کھلم کھلا اسلامی قوانین اور اقدار کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ جب اسلامی نظام کے نفاذ اور خلافت کی بات آتی ہے تو اسے فرسودہ، غیر منصفانہ اور ظالمانہ قرار دے کر اس کے قوانین اور حدود کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں میں رتی برابر ایمان بھی نہیں اور نہ ہی ان کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ ان دو مؤخرالذکر لوگوں کو سب سے زیادہ غصہ مُلا پر آتا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ

"مُلاازم" ہے۔ وہی حق پرست مُلا جو ڈیڑھ ہزار سال میں علم و عمل کے آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی مانند علماء محدثین اور مفکرین کے فہمِ دین پر اعتماد کرتا ہے اور کسی کو کتاب وسنت کے نصوص کی من مانی تشریح کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر علماء حق نہ ہوتے تو آج دین نہ ہوتا۔ ہاں ہم مانتے ہیں وہ دنیاپرست مُلّا جن کو حق سے کوئی سروکار نہیں سوائے اپنے مفاد کے اس کے ہم بھی خلاف ہیں اور نہ وہ علماء میں شمار ہیں۔

ہماری ان مغربی جمہوریت کے حامیوں ،ماڈریٹ اسلام اور سیکولر ذہنیت والوں سے یہ گزارش ہے کہ خدارا اپنی ذاتی خواہشات اور مغربی ترجیحات پر اسلام کا لیبل چسپاں نہ کرو اور ترقی کی دوڑ کا ساتھ دیتے ہوئے اتنی دور نہ نکل جاؤ کہ صرف ماڈریٹ باقی رہ جائے اور مغرب کی خوشنودی حاصل کرتے کرتے کہیں اسلام ختم نہ ہو جائے۔

اس کے لیے طریقہ کار:

اب اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی سیاست وریاست قائم کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہوگا؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ قرآن وسنت اور سلف صالحین کے طرزِ عمل سے دو طریقے معلوم ہیں۔ایک جہاد جس کی مثال مکہ میں اسلامی ریاست وخلافت کا قیام جو جہاد کے ذریعے عمل میں آیا۔اور دوسرا راستہ عامۃا لمسلمین میں تعلیم وتربیت اور دروسِ قرآن کے ذریعے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے بعد سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں منظّم جدوجہد جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی شاہد ہے کہ مدینہ میں اسلامی ریاست وخلافت کا قیام ذہنی انقلاب اوراصلاح سے وجود میں آیا۔

ہمیں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے فلسفہ فُکَّ کُلَّ نِظَامٍ پر عمل کرکے مکمل نظام کو تبدیل کرنا ہوگا۔ زندگی کے پورے ڈھانچے کو بدلنا ہوگا۔ عقائد کی درستگی کے بعد معیشت، تجارت، معاشرت اور اخلاق اور سیاست کو شرعی اصولوں کے قالب میں ڈالنا ہوگا۔

اسلام کے مزاج، مسلمانوں کی پچھلی تاریخ اوراپنے زمانہ کے احوال پر غور کرنے کے بعد ہمیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمان اللہ کے فضل سے اکثریت میں ہیں اور وہاں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی سچی خواہش رکھتے ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی کو ایمانی اوراسلامی بنانے کی جانی چاہیے کہ دنیا کی فکر اور محبت پر آخرت کی فکر اوردین کی محبت غالب ہوجائے اور رضائے الٰہی کی طلب وثواب

آخرت کی طمع میں نفس کی خواہشوں کو قربان کرنا ان کے لئے آسان ہو جائے۔ مسلمانوں میں جب تک وسیع پیمانے پر اصلاحی جدوجہد کے ذریعے تبدیلی نہیں آئے گی تب تک اسلامی نظام کا نفاذ محض ایک خواب ہی رہے گا۔ یہ راستہ اگرچہ قدرے دشوار اور طویل ہے، لیکن راستہ صرف یہی ہے اور اس کے سوا جن راستوں کو لوگ مختصر سمجھ کر چلنے لگے ہیں مثلاً مغربی جمہوریت وغیرہ تو یہ راستہ منزل تک پہنچانے کی بجائے بھٹکانے والا ہے۔

عقائد اور دیگر بالا شعبہ ہائے دین پر محنت کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اسلامی نظام کے فوائد و اہمیت اور غیر شرعی نظام کے نقصانات سے روشناس کرایا جائے۔ اس سلسلہ میں انکی ذہنی تربیت کرکے ذہنی انقلاب برپا کریں۔ اس ضمن میں ابتدائی مراحل کے طور پر ان کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ احکام و قوانین جو بغیر حاکم اور خلیفہ کے عوام کے مابین ہوں پر عمل درآمد کریں، چھوٹے موٹے مقدمات مساجد اور اپنے محلوں میں علماء کی نگرانی میں قرآن وسنت کے مطابق حل کریں، کیونکہ اسلامی قانون اور شریعت کے تقریباً دو حصے احکام اور اس کا نفاذ عوام کے ہاتھ میں ہے جس کو احکام رعیت یا تدبیر منزل کے احکام کہتے ہیں۔ باقی تقریباً ایک حصہ احکام جو عوام اور حکمرانوں کے ذریعے نافذ ہو سکتے ہیں اس کے لیے بھی ساتھ ساتھ جدوجہد ہونی چاہیے۔

عوامی ذہنی انقلاب اور اصلاح کے ساتھ ساتھ مقتدر طبقہ پر بھی محنت کرنی چاہیے، ان کو بھی اسلام کے قریب لانے کی کوشش کرنی چاہیے ان کو اسلام مکمل نظام حیات (سسٹم آف لائف) کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔ یہ مجددی سیاست ہے جس کے لیے ہمارے پاس مجدد الف ثانی کا طرز عمل بطور مشعل راہ موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں مکمل دین کی سمجھ، اس پر عمل کرنے اور اس کے اقامت و نفاذ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین وما علینا الا البلاغ۔

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف
.1	حجۃ اللہ البالغہ	محدث دہلوی شاہ ولی اللہؒ
.2	بدور البازغہ	محدث دہلوی شاہ ولی اللہؒ
.3	اسلام کے بنیادی عقائد	علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
.4	عقائد الاسلام	شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ
.5	عقائد الاسلام	مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
.6	البصائر	شیخ القرآن مولانا محمد طاہرؒ
.7	جواہر التوحید	شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ
.8	وجود باری تعالیٰ اور توحید	ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ شہیدؒ
.9	القائد فی العقائد	علامہ محمد حسین شاہ نیلویؒ
.10	گلدستہ توحید	مولانا سرفراز خان صفدر صاحبؒ
.11	عقیدہ توحید اور رد شرک	بندہ محمد آیاز
.12	اسلام کا اخلاقی نظام	مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ
.13	اخلاق و فلسفہ اخلاق	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
.14	جامع الاخلاق	مولانا عاشق الٰہیؒ
.15	تزکیہ نفس اور تہذیبِ اخلاق	مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ
.16	اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت	مولانا مفتی محمد شفیعؒ
.17	اسلامی معاملات اور اسکی اصطلاحات	بندہ محمد آیاز
.18	اسلامی تہذیب	مولانا اشرف علی تھانویؒ
.19	آدابِ زندگی	مولانا اشرف علی تھانویؒ

20.	اسلام کا اقتصادی نظام	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
21.	صفائیِ معاملات	مولانا اشرف علی تھانویؒ
22.	اسلامی معاشیات	مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
23.	ہمارا معاشی نظام	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
24.	اسلام اور جدید معشیت و تجارت	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
25.	یورپ کے تین معاشی نظام	مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب
26.	اسلامی تہذیب و تمدن	مولانا قاری محمد طیبؒ
27.	فطری حکومت	مولانا قاری محمد طیبؒ
28.	السیاسۃ الاسلامیہ	مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ
29.	مسئلہ خلافت	مولانا ابو الکلام آزادؒ
30.	مسلمانوں کا نظمِ مملکت	مولانا علیم اللہ صدیقیؒ
31.	خبرے شل سریے یو	شیخ ولی اللہ صاحب کابلگرامیؒ
32.	اعلام الاعلام بمفھومِ الدین والاسلام	شیخ ولی اللہ صاحب کابلگرامیؒ
33.	دین و شریعت	مولانا محمد منظور نعمانیؒ
34.	تعریفِ عام بدین الاسلام	شیخ علی طنطاوی دمشقیؒ